تعلیم و تربیت

فروری 2018

پہلی ویب سائٹ اردو ڈائجسٹ، ناولز
PP
پاکستانی پوائنٹ
ایک رابطہ اپنوں سے
www.pakistaniPoint.com

77 واں سال دسواں شمارہ
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

فروری 2018

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
حمد و نعت	امان اللہ نیر شوکت	2
درسِ قرآن و حدیث	محمد حبیب الیاس	3
کشمیر کی سیر	علی اکمل تصور	4
ولیم اور سیب	کاشف شیرازی	8
پیارے اللہ کے پیارے نام	راشد نواب شاہی	11
بوجھو تو جانیں		12
مینار مسجد	غلام حسین میمن	13
کھیل اس صفحے کا		15
ننھی کلیاں	علامہ اقبال	16
دماغ لڑاؤ	ذہین قارئین	18
ویت نام کے آدم خور	مقبول جہانگیر	19
کھوج لگائیے	ننھے کھوجی	24
میری زندگی کے مقاصد	پرعزم قارئین	25
[illegible]	اقتباسات	26
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض	28
[illegible]		30
کوپن	ادارہ	31
15	نعیم شاہد	32
ہماری زمین	قمر احمد علی خان	33
آپ بھی مسکرائیں	خوش ذوق قارئین	35
پہلے تولو پھر بولو	حنظلہ آفاق	36
شرارت کی چڑیا	ساجد محبوب	37
ندامت کے آنسو	ساجد کھوکھر	40
ویران ڈبے کا راز	احمد عدنان طارق	43
آپ بھی لکھیے	ننھے ادیب	47
20 سال بعد	سید انیس احمد	51
پیارے بچوں کی ڈاک	ننھے منے قلم کار	55
[illegible]		57
جلیبی	محمد شکیل چوہدری	60
ملکو میاں	سعید لخت	62
بلاعنوان	دل چسپ لطیفے	64

اور بہت سے دل چسپ ڈرامے اور لطیفے

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ان کی عظمت و شان کے تاج پر سادگی کا طرّہ نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف روم و شام کی فوجیں بھیج رہے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ درپیش ہے۔ دوسری طرف بدن پر بارہ پیوند لگا کرتا ہے۔ سر پر پھٹا عمامہ ہے۔ پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں۔ کاندھے پر مشک لیے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچا دیں یا مسجد کے کسی گوشے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہیں اس لیے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور نیند کی جھپکی سی آ گئی ہے۔

بارہا مکہ سے مدینہ سفر کیا لیکن شامیانہ یا خیمہ کبھی ساتھ نہیں رہا۔ جہاں ٹھہرے درخت پر چادر ڈال دیا اور اسی کے سائے میں پڑ رہے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ان کا روزانہ خانگی (گھریلو) خرچ دو درہم تھا۔ احنف بن قیس، رؤسائے عرب کے ساتھ ان کو ملنے گئے۔ دیکھا تو دامن چڑھائے ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ احنف کو دیکھ کر کہا۔ ''آؤ تم بھی میرا ساتھ دو، بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔'' ایک شخص نے کہا۔ ''امیر المومنین آپ تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، کسی غلام کو حکم دیجیے۔ وہ ڈھونڈ لائے گا۔ فرمایا: ''ای عبد اعبد منی'' یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے۔''

پیارے بچو! یہ عظیم المرتبت ہستی ہمارے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ جن کی سادگی اور انصاف بے مثال تھا۔ خلیفہ ہونے کے باوجود ان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ عزیز ساتھیو! ہمیں بھی چاہیے کہ ہم سادہ زندگی گزاریں۔ کسی بڑے عہدے کا فائدہ نہ اٹھائیں۔ یعنی اگر مرتبہ مل جائے تو شاہانہ طرزِ زندگی سے گریز کریں۔ سمجھ لیجیے کہ بیت المال یا سرکاری خزانے کا پیسہ عوام کا ہی پیسہ ہے۔ اسے عوام پر ہی خرچ کریں کیوں کہ ہر ایک اپنے اعمال اور دیانت و خیانت کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ بات صرف اتنی سی کہنی ہے کہ سادگی اختیار کریں کیوں کہ اس وقت ہمارے پیارے وطن کو سادگی اور بچت کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں ضرور سوچیے۔

فی امان اللہ
ایڈیٹر

''پاکستان زندہ باد''

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن انچارج: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
ہیڈ آفس و شوروم: 60، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بذریعہ بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر، ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361310-36361309 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ 35 روپے

حمد باری تعالیٰ

سارے جہاں کا یا رب پروردگار تو ہے
دنیا ہے ایک گلشن ، اس کی بہار تو ہے
گلشن میں ہر طرف ہے جلوہ ترا ہی یا رب
کلیوں کی دل کشی تو ، گل کا نکھار تو ہے
کر کے تری عبادت ، ملتی ہے ایک راحت
یعنی ہمارے دل کا چین و قرار تو ہے
چھوٹے بڑے کا رازق بے شک ہے تو ہی یا رب
دیتا ہے سب کو نعمت جو بے شمار تو ہے
شمس و قمر ، ستارے تو نے ہی ہیں بنائے
جس نے کیے ہیں پیدا لیل و نہار تو ہے
چڑیا بھی ہے چہک کر تیرا ہی ذکر کرتی
پتھر کی خامشی سے بھی آشکار تو ہے
آتا ہے کام سب کے مشکل میں نام تیرا
سنتا ہے جو دلوں کی آہ و پکار تو ہے
جن کا نہیں ہے کوئی ان کا ہے تو سہارا
بے کس کا ، بے بسوں کا لا ریب یار تو ہے

لیل و نہار: صبح و شام
لاریب: بے شک

نعت رسول مقبول ﷺ

سب سے بھلائی جن کا اصول
وہ ہیں ہمارے پاک رسول ﷺ
ان کا در اور اشک وفا
کیوں نہ دعائیں ہوں مقبول
شانِ محمد ﷺ کیا جانیں
جن کی آنکھوں میں ہے دھول
اللہ ! اللہ ! محمد ﷺ کی شان
ایک اک بات ہے ایک اصول
بعد خدا مختار ہیں آپ ﷺ
کیا دینا باتوں کو طول
اکسیروں سے بڑھ کر ہے
طیبہ کی گلیوں کی دھول
طیبہ کی وادی میں چل
اس کے کانٹوں میں بھی پھول
نبیوں کے سرتاج ہیں آپ ﷺ
نیر تو یہ بات نہ بھول

امان اللہ نیر شوکت

طول: لمبائی یا لمبا کرنا
اشک: آنسو
اکسیروں: دواؤں، علاج

محمد طیب الیاس

نجات دلانے والی سورت

پیارے بچو! قرآن پاک کے انتیسویں (29) پارہ کی پہلی سورت "سُوْرَةُ الْمُلْک" ہے۔ حدیث شریف میں اس کو "وَاقِیَة اور مُنْجِیَة" بھی فرمایا گیا ہے۔ وَاقِیَة کے معنی ہیں "بچانے والی" اور مُنْجِیَة کا معنی ہے "نجات دینے والی۔" اس سورت کے بہت سے فضائل اور خواص ہیں۔ اس سورت کی سب سے بڑی فضیلت اور خاصہ یہ ہے کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے کو قبر کے عذاب سے بچاتی اور نجات دلاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ اپنا خیمہ لگایا، وہاں قبر تھی جس کا انہیں علم نہ تھا، وہاں انہوں نے ایک شخص کی آواز سُنی جو سورت "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" پڑھ رہا تھا، اُس نے پوری سورت ختم کر لی۔ یہ صحابی رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو پوری کیفیت سنائی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: یہ سورت قبر والے شخص کو اللہ کے عذاب سے روکنے والی اور نجات دینے والی ہے۔ (جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن:2890) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کتاب اللہ میں ایک ایسی سورت ہے، جس کی آیتیں تو صرف تیس (30) ہیں، قیامت کے دن یہ ایک شخص کی سفارش کرے گی، یہاں تک کہ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گی اور وہ سورت ہے "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" (تفسیر قرطبی، سورۃ الملک 205/18) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب تک سورت الٓمّٓ تَنْزِیْل (جو اکیسویں پارہ میں ہے) اور سورت "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" نہیں پڑھ لیتے تھے اس وقت تک رات کو نہیں سوتے تھے۔ (جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن:2892) معلوم ہوا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے یہ دو سورتیں ضرور تلاوت فرماتے تھے۔ نیز حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ "یہ دونوں سورتیں قرآن پاک کی دیگر سورتوں پر ستر (70) نیکیاں فضیلت رکھتی ہیں۔ (جامع ترمذی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ سورت "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" ہر مؤمن کے دل میں ہو۔ (تفسیر الثعلبی، سورۃ الملک، 354/9) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ہر رات سورت "تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ" کی تلاوت کی، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس سے عذاب قبر کو روک دیں گے، ہم (صحابہ کرام نے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سورت کا نام "اَلْمَانِعَة (عذاب روکنے والی)" رکھا ہوا تھا، یہ قرآن کریم میں ایسی سورت ہے جس نے اس کو رات کے وقت تلاوت کیا اس نے بہت زیادہ عمل کیا اور بہت بہتر عمل کیا۔ (عمل الیوم واللیلۃ للنسائی:710) پیارے بچو! آپ نے جانا کہ سورۃ الملک روز قیامت سفارش کرنے والی ہے، عذاب قبر سے نجات دلانے والی ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ کے معمولات میں سے ہے، تو قرآن پاک کی ایسی عظیم الشان سورت سے ہمیں غفلت نہیں برتنی چاہیے اور رات سونے سے پہلے ضرور اس کو پڑھنے کا معمول بنانا چاہیے، کیوں کہ قبر کا عذاب بہت خوف ناک اور ہول ناک ہے اور ہم میں سے ہر ایک اس سے بچنے کا خواہش مند ہے۔

☆☆☆

اس کی نیل گوں آنکھیں جھیل جیسی گہری تھیں۔ رخسار جیسے سرخ سیب۔ لمبے بال، ریشمی اور سنہرے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ایک ننھی سی حور کا احساس ہوتا تھا۔ جو غلطی سے زمین پر اتر آئی ہو اور اسے جنگل کے وحشی درندوں نے گھیر لیا ہو۔ وہ اس وقت درندوں کے حصار میں ہی تو تھی، مگر یہ جنگلی جانور نہیں تھے۔ یہ تو انسان تھے۔ انہوں نے سفید رنگ کے ڈھیلے ڈھالے لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے چہروں پر گھنی اور لمبی داڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ موجود تھا۔ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگا رہے تھے اور وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی مانند چنار کے درخت کے تنے کے ساتھ دبکی بیٹھی تھی۔ وہ ایک قافلے کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی اور پھر ان ظالم انسانوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

"کک..... کون ہو تم لوگ؟ اس نے سوال پوچھا۔ دنیا بھر کا خوف اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کی آواز بھی کپ کپا رہی تھی۔

"ہم..... ہم طالبان ہیں..... پہلے تو ہمیں علم کی طلب تھی مگر اب ہمیں آزادی کی طلب ہے۔" ان میں سے ایک نے دانت نکالے۔ "آزادی..... کس کی آزادی؟" یہ اس کا دوسرا سوال تھا۔

"کشمیر کی آزادی..... کشمیری عوام کی آزادی۔" اب دوسرے نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔

"میں کشمیری ہوں۔" وہ ہمت کر کے بولی۔ "مگر ہمیں تو آزادی نہیں چاہیے..... ہم لوگ..... ہم سب لوگ بہت خوش ہیں۔ بھارتی افواج اور پولیس کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے۔ بھارتی حکومت ہمارا خیال رکھتی ہے۔ ہم لوگ اس وادی میں امن سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ امن کے اصل دشمن تو تم لوگ ہو۔ نہ خود چین سے جیتے ہو اور نہ ہی ہم لوگوں کو چین سے جینے دیتے ہو۔" اچانک ہی اس معصوم بچی میں اتنی ہمت جانے کہاں سے آ گئی تھی۔

"خاموش رہ بانی کی بچی۔ تم اور تمہارا باپ بھی بانی ہے۔ تمہارا باپ بھارتی افواج کا ساتھ دیتا ہے۔ عوام کو ہمارے خلاف ورغلاتا ہے۔ اس جرم کی سزا ملے گی تمہیں۔ یہاں..... اور..... تمہارے باپ کو آج رات..... تمہارے گھر میں۔" اس نے اے کے 47 کی نال کا رخ اس معصوم کی طرف کر دیا۔ اس معصوم کے چہرے پر خوف کی ذرہ بھر علامت نہ تھی۔ اب اسلحہ بردار دھاڑ کو بولا۔ "مرنے سے پہلے بھگوان کو یاد کر لو۔" یہ بات کہتے کہتے اسلحہ

بردار گھبرا گیا۔ ''کٹ..... کٹ..... کٹ۔'' ایک زوردار آواز فضا میں گونجی۔ ''بے وقوف انسان..... یہاں بھگوان کا نام نہیں لینا۔ اللہ کو یاد کرنا ہے..... کیا کہا؟ اللہ کو یاد کرنا ہے۔'' وہ گلے کے بل چلایا۔ جانے کیسے کیسے احمق اداکار بننے کے لیے چلے آتے ہیں۔ سارے شاٹ کا ستیاناس کر دیا۔'' اس کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''بریک ٹائم..... بریک ٹائم۔'' اس کے نائب نے آواز بلند کی۔ یہ آواز سن کر سب نے سکون کا سانس لیا۔ اب کیمرے کی آنکھ بند ہو چکی تھی۔ روشنی دینے والے بلب بھی بند ہو گئے۔ اداکاروں نے اپنی نقلی داڑھیاں اتار دیں۔ ہاتھوں میں موجود نقلی اسلحہ بھی ایک طرف رکھ دیا۔ سفید رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لباس بھی اتار دیا۔ اب وہ سب شرٹ اور پتلون میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ وہ معصوم لڑکی بھی درخت کے تنے کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مشکل سے بارہ برس کی تھی۔ اب وہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔

''آ جاؤ بیٹا..... تم نے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا۔'' اس لڑکی کی والدہ اسے پکار رہی تھی۔ اس دستاویزی فلم کی ریکارڈنگ کے لیے وہ اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھی۔ ''اس بات میں شک نہیں کہ رادھا پنڈت ایک بہت اچھی فن کارہ ہے۔ مستقبل میں یہ لڑکی سپرسٹار ہوگی..... سپرسٹار۔''

''بھگوان کی کرپا ہے۔'' رادھا کی والدہ جلدی سے بولی۔

''ہاں..... بھگوان کی کرپا ہے۔'' وہ مسکرانے لگا۔ اس کا نام روشن داس تھا۔ وہ اس فلم کا ڈائریکٹر تھا۔ یہ ایک بڑے بجٹ کی پروپیگنڈا فلم تھی۔ جو بھارتی سرکار کے کہنے پر تیار کی جا رہی تھی۔ اس فلم کی تیاری کا مقصد بین الاقوامی پلیٹ فارم پر مقبوضہ کشمیر میں چل رہی آزادی کی تحریک کو بدنام کرنا تھا۔ مسلمانوں کو شدت پسندوں کے روپ میں پیش کرنا تھا۔ سال بھر اس فلم کی تیاری کے لیے ہوم ورک کیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ایسی لڑکی کی تلاش تھی۔ جو اس فلم کا مرکزی کردار خوبی سے ادا کر سکے۔ جس کے خدوخال کشمیری لڑکیوں جیسے ہوں اور پھر انہیں رادھا ملی۔ رادھا ایک ایکسٹرا اداکارہ کی بیٹی تھی۔ اس کی والدہ کے لیے تو جیسے قسمت کی پٹاری کھل گئی۔ اس نے فوراً سے پہلے سری نگر آنے کی ہامی بھر لی۔ اب کڑے پہرے میں اس پروپیگنڈا فلم کی تیاری کا عمل جاری تھا۔ رادھا کو اداکاری کا فن اس کی والدہ کی طرف سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ اپنے مکالمے فوراً یاد کر لیتی تھی۔ ایک ہی کوشش میں وہ اپنا منظر مکمل کروا دیتی۔ جب کہ ساتھی اداکار ہمیشہ اس کے لیے مشکل کھڑی کر دیتے تھے۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش تھی۔ ایک تو اس کا شوق پورا ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے جنت نظیر وادی کشمیر کی سیر و تفریح کا موقع بھی مل رہا تھا۔

ریکارڈ ہو رہا منظر کافی طویل تھا۔ ابھی اس منظر میں بھارتی افواج کو بھی داخل ہونا تھا اور رادھا کی جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کے مناظر بھی فلمائے جانے تھے۔ شام ہونے والی تھی لہٰذا روشن داس نے باقی کا کام کل پر ملتوی کر دیا۔ اب ساز و سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ پھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ یہ پانچ گاڑیاں تھیں۔ ان میں ایک گاڑی مسلح بھارتی فوجیوں کی تھی۔ جو اس قافلے کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس قافلے نے ابھی مشکل سے دو کلومیٹر سفر طے کیا تھا کہ سامنے انہیں ایک ناکہ نظر آیا۔ یہاں بھی مسلح بھارتی فوجی نظر آئے۔ بہت دُور دھوئیں کے بادل بھی اٹھ رہے تھے۔ جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ آگے جانے کا راستہ بند ہے۔ سڑک پر احتجاج ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے انہیں متبادل راستے سے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہونا تھا۔ جہاں ان سب کا قیام تھا۔ اب گاڑیاں موڑ کاٹ کر نیم پختہ راستے پر چل پڑیں۔ ان کی رفتار بھی اب نسبتاً سست تھی۔ رادھا کو دور پختہ سڑک نظر آ رہی تھی۔ اس سڑک پر اسے ایک بے قرار ہجوم نظر آیا۔ اس ہجوم میں بہت سے افراد نے پاکستانی سبز ہلالی پرچم اٹھا رکھے تھے۔ رادھا اس منظر میں کھو سی گئی۔ پھر اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ آگ کے شعلے نظر آنے لگے۔

''دھائیں..... دھائیں۔'' اب فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ قافلے میں موجود تمام افراد کی جان پر بن آئی تھی۔ کیوں کہ بنیادی طور پر یہ تمام افراد بزدل تھے۔ رادھا نے دیکھا کہ بہت سے افراد پکی سڑک سے اتر کر بھاگ نکلے تھے۔ پھر بہت سے بھاگتے بھاگتے گر پڑے۔ ان سب کو عقب سے گولیاں لگی تھیں۔ ان میں سے اس کی عمر کی ایک لڑکی اب بھی بھاگ رہی تھی، بھاگتے بھاگتے وہ اس قافلے کے قریب پہنچ چکی تھی، وہ زخمی تھی۔ وہ گرتی پڑتی اس گاڑی کے قریب آ گئی۔ جس میں رادھا کھڑکی والی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رادھا شیشے کے اس پار سے دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کی

سکت ختم ہو چکی تھی۔ پھر وہ ٹھوکر کھا کر شیشے سے ٹکرائی اور گر پڑی۔ اسے پہلو میں گولی لگی تھی۔ اس کے دونوں خون آلود ہاتھ شیشے پر نقش ہو گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کے اس نقش کے درمیان سورج غروب ہو رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کا رنگ بھی سرخ تھا۔ شاید وہ بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سفر جاری تھا، مگر رادھا نے جو منظر دیکھا تھا! وہ اس کے لاشعور میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ اب تک ڈرنے کی اداکاری کرتی رہی تھی۔ ڈر کیا ہوتا ہے؟ وہ اس نے اب محسوس کیا تھا۔ خوف اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ ابھی ابھی اس نے جو مناظر دیکھے تھے۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آوازوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جب یہ قافلہ ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوا۔ ہوٹل کے چاروں طرف بھارتی فوج کا پہرہ تھا۔ اس ہوٹل کے ملازم سامان اٹھانے کے لیے گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ ان ملازموں میں ایک بوڑھا آدمی بھی موجود تھا۔ رادھا نے دیکھا۔ ملازم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ”کیا ہوا بابا جامو.....“ رادھا نے اس بوڑھے ملازم سے پوچھا۔ پچھلے پندرہ دنوں کے قیام کے دوران وہ بابا جامو کو پسند کرنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں بیٹا..... کچھ نہیں۔“ بابا جامو سسکی بھر کر بولا۔ وہ سامان اٹھانے لگا تو رادھا نے اسے روک لیا۔ ”بتاؤ نا بابا جامو..... آپ کیوں رو رہے ہیں؟“ رادھا کے لہجے میں اپنا پن دیکھ کر بابا جامو بولا۔ ”ہر سال پانچ فروری کو ہم اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ ساتھ یہاں مقبوضہ کشمیر میں بھی یوم کشمیر مناتے ہیں۔ ہم سب مل کر غلامی کے خلاف اور آزادی کے حق میں پرامن احتجاج کرتے ہیں اور ہر سال بھارتی فوج اپنے ظلم سے اس احتجاج کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ آج ہونے والے احتجاج میں میرا پوتا بھی موجود تھا۔ ان ظالموں نے اسے گولی مار دی ہے۔“ بابا جامو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”احمق..... کیوں بچی کا ذہن خراب کر رہے ہو۔“ روشن داس نے بابا جامو کو ڈانٹا۔ ”چپ رہیں انکل..... مجھے بات کرنے دیں۔“ رادھا تنک کر بولی۔ روشن داس، بابا جامو کو گھورتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ”بابا جامو..... میں نے تو سنا ہے کہ دشمن سرحد پار سے آتا ہے۔“ رادھا نے اپنے دل میں موجود سوال اٹھایا۔ ”سب جھوٹ ہے بیٹا..... اتنے کڑے پہرے میں باہر سے کوئی نہیں آ سکتا..... یہ ہم ہی ہیں جو اک عرصے سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم ظلم سے آزادی چاہتے ہیں، ایک غاصب ملک سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس کوشش میں میرا بیٹا پہلے ہی شہید ہو چکا ہے اور اب..... اب میرا پوتا بھی۔“ بابا جامو بڑی مشکل سے بات مکمل کر پا رہا تھا۔ اس کا دل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ ”آپ کو اپنے پوتے کے پاس جانا چاہیے۔“ رادھا نے تجویز دی۔ ”میں جانا تو چاہتا ہوں، مگر یہ پہرے دار جانے نہیں دے رہے۔“ بابا جامو نے حفاظت پر مامور بھارتی فوجیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تو ظلم ہے۔“ رادھا بے اختیار بولی۔

”اسی لیے تو ہمیں آزادی چاہیے۔“ رادھا، بابا جامو کے آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ اپنی غربت کی وجہ سے بابا جامو اس ہوٹل میں ملازمت کرنے پر مجبور تھا۔ اسے رات گئے چھٹی ملی اور وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ مگر رادھا کو سوچنے کی دعوت دے گیا۔ وہ ساری رات رادھا نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں گزار دی۔ اگلی صبح یہ قافلہ ہوٹل سے روانہ ہوا۔ بابا جامو موجود نہیں تھا۔ رادھا سمجھ گئی کہ بابا جامو اپنے پوتے کے پاس ہوگا۔ اس کے ننھے سے دل پر بوجھ تھا، وہ اداس تھی۔ پھر یہ قافلہ اسی مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں اس فلم کی تکمیل کا عمل ادھورا رہ گیا تھا۔ اب اس فلم کی عکس بندی کا سلسلہ وہیں سے شروع ہونا تھا۔ رادھا ایک مظلوم کشمیری لڑکی کے روپ میں موجود تھی۔ دشمن نے اس پر بندوق تان رکھی تھی۔ یہاں سے بھارتی فوج کو منظر میں داخل ہونا تھا اور اس کشمیری لڑکی کی جان بچانا تھی۔ رادھا اپنے حصے کے مکالمے بول چکی تھی۔ باقی عکس بندی خوبی سے اپنے انجام کو پہنچی۔

”رادھا..... سنو..... غور سے سنو..... اب تمہیں بھارتی فوج کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچایا ہے۔ تمہارا مکالمہ کچھ یوں ہے..... شکریہ انکل..... مجھے یقین تھا کہ آپ میری حفاظت کے لیے آئیں گے۔ رادھا..... رادھا..... تمہارا دھیان کدھر ہے؟“ روشن داس، رادھا کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

”جی..... جی..... مجھے کیا کہنا ہے۔“ رادھا چونک کر بولی۔ وہ تو ابھی تک بابا جامو کی باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔

”شکریہ انکل..... مجھے یقین تھا کہ آپ میری حفاظت کے لیے آئیں گے۔“ روشن داس نے اسے اس کی سطر پڑھ کر سنائی۔

"مجھے یقین تھا۔" رادھا اٹکتے ہوئے بولی۔ "شکریہ انکل..... پہلے کہنا ہے۔" روشن داس نے اس کی اصلاح کی۔

"ٹھیک ہے....." رادھا بولی۔ "کر لو گی نا.....؟" روشن داس اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رادھا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب کیمرے نے آنکھ کھولی۔ بلب جل اٹھے، پھر روشن داس بلند آواز میں بولا۔ "ایکشن....." منظر ریکارڈ ہونے لگا۔ رادھا نے سر اٹھایا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے بھارتی فوج کی یونی فارم میں ملبوس اداکار کی طرف دیکھا اور بولی۔ "شکریہ انکل..... مجھے یقین تھا کہ آپ۔" "کٹ..... کٹ۔" روشن داس چلایا۔ "رادھا..... اپنی آنکھوں میں خوشی اور جوش کے ملے جلے تاثرات لے کر آؤ اور مسرت بھری لہر میں پیار سے بولو۔ شکریہ انکل۔" ایک بار پھر سے تیاری مکمل ہوئی۔ "ایکشن.....؟" روشن داس بولا۔ "شکریہ انکل..... مجھے یقین۔"

"کٹ..... کٹ..... کٹ۔" روشن داس غصے سے دھاڑا۔ "میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔" رادھا نے روشن داس سے کہا۔ اس بار اس کی آواز میں جوش تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غبار سا پھیل گیا۔ وہ سسکیاں بھرتے اس گاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ جس میں بیٹھ کر وہ یہاں آئی تھی۔ "اسے کیا ہوا؟" روشن داس حیرت سے بولا۔ روشن داس ہی کیا..... اس قافلے میں موجود تمام افراد کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کشمیری لڑکی کے بہروپ میں کشمیر کی حور نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تھا۔ بھارتی حکومت کا پروپیگنڈہ ناکام ہو رہا تھا۔ جنت نظیر کشمیر میں موجود یہ حور جنت میں موجود حوروں جتنی ہی معصوم اور پاک تھی۔ اس کا ضمیر بے دار تھا، وہ کھری لڑکی تھی اور باہمت بھی۔ ☆☆☆

انمول موتی

- ☆ عزت اور خاموشی بڑی انمول چیزیں ہیں عزت خاموشی سے اور خاموشی بولنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔
- ☆ ہر بے موقع بات بے معانی ہوتی ہے۔
- ☆ دنیا کا بدترین شخص وہ ہے جسے عزت کے معانی کا نہیں پتا۔
- ☆ نام کمانا جتنا آسان ہے عزت کمانی اتنی ہی مشکل ہے۔
- ☆ اس علم کا کیا فائدہ جس پر عمل نہ کیا جائے۔
- ☆ انسان علم کے بغیر ادھورا جب کہ معلم اخلاق حسن کے بغیر ادھورا ہے۔
- ☆ جتنے میٹھے لہجے میں بات کی جائے عزت اتنی بڑھتی ہے۔

(سعید عباس، اٹھارہ ہزاری)

ولیم اور ٹیل

کاشف ضیائی

سوئزر لینڈ یورپ کا ایک خوب صورت ترین ملک ہے جو اپنے اونچے اونچے پہاڑوں، سرسبز وادیوں اور صاف شفاف جھیلوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ یورپ کے درمیان میں واقع ہے اور اس کے ارد گرد فرانس، جرمنی اور آسٹریا کے ملک آباد ہیں۔ سوئزر لینڈ کے رہنے والوں کو "سوئس" کہا جاتا ہے اور سوئس لوگ اپنی کاشت کاری اور انجینئرنگ کی وجہ سے سب جگہ مشہور ہیں۔

آج ہم جو کہانی آپ کو سنانے جا رہے ہیں وہ چھ سو سال پہلے کی ہے۔ اس زمانے میں یہ ملک آزاد نہ تھا بلکہ اپنے ہم سایہ ملک آسٹریا کا غلام تھا۔ یعنی سادہ لفظوں میں آسٹریا کا بادشاہ ہی یہاں کا بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں سوئزر لینڈ کے تقریباً درمیان میں ایک قصبہ "آلڈ روف" تھا جہاں قریب ہی ایک کسان ولیم کا کھیت تھا۔ آسٹریا کی طرف سے آلڈروف اور اس کے ارد گرد کے علاقوں پر "گیسلر" نام کا ایک شخص حاکم کے طور پر مقرر تھا۔ گیسلر بہت ظالم آدمی تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم موٹا تھا، چہرے پر داغ تھے اور سب سے زیادہ خوف ناک چیز اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں جو اتنی سرخ رہتیں جیسے ان میں خون اترا ہوا ہو۔ جب سے وہ اس علاقے کا حاکم بنا تھا اس نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی نیا حکم دے دیتا اور لوگوں کو اس کے ماننے پر مجبور کرتا۔ ایک اور کام اس نے یہ کیا کہ آلڈروف کے بازار میں ایک ستون بنوایا۔ پھر اس پر ایک شان دار ٹوپی لٹکوائی جس پر آسٹریا کا جھنڈا بنا ہوا تھا اور حکم دیا کہ بازار میں آنے والا ہر شخص اس ٹوپی کو سر جھکا کر سلامی دے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو یہ یقین آ جائے کہ وہ غلام ہیں اور آسٹریا والے ان کے آقا ہیں۔ یہ حکم کتنا ذلت آمیز تھا۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو جب بھی بازار آتے پہلے ٹوپی کے سامنے سر جھکاتے اور پھر دوسرے کام کرتے۔ اس کے سوا اور چارہ بھی نہ تھا۔ کوئی شخص اگر ایسا کرنے سے انکار کرتا تو گیسلر کے سپاہی مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے۔

ایک دن ولیم کسی کام سے آلڈروف آیا۔ اس کا بیٹا والٹر بھی اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے اپنے کھیت کے لیے کچھ ضروری آلات خریدنے تھے۔ چوں کہ وہ قصبے سے باہر رہتے تھے اس لیے انہیں اس نئے قانون کے بارے میں پتا نہ تھا۔ کسی دوسرے نے بھی کچھ نہ بتایا تھا اس لیے جب وہ ستون کے قریب سے گزرے تو سر جھکا کر سلامی نہ دی۔ پہرے پر موجود سپاہیوں نے اسی وقت انہیں گرفتار کیا اور دھکے مارتے ہوئے گیسلر کے سامنے پیش کر دیا۔

"کیا تم نے میرا حکم نہیں سنا بے وقوف کسان؟" گیسلر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جناب۔" ولیم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بالکل نہیں سنا تھا اور اگر سنا بھی ہوتا تو میں کسی ایسے کام کو کیسے کر سکتا ہوں جسے میرا ضمیر ہی گوارا نہ کرتا ہو۔" گیسلر کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ "تم تو اچھے بھلے گستاخ ہو۔" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ولیم کو کچا چبا جائے جب کہ وہ ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"یہ تیر کمان کیوں ہے تمہارے پاس۔" گیسلر کا اشارہ اس کمان کی طرف تھا جو اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔

"شکار کے لیے۔" ولیم نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم جنگلی لوگ ہیں جناب، ہرن مار کر کھاتے ہیں، ہمیں اس کے رکھنے کی اجازت ہے۔"

گیسلر ایک مرتبہ پھر لاجواب ہو گیا لیکن فوراً پھنکار کر کہنے لگا۔ "بہت بک بک کرتے ہو تم، تم نے قانون توڑا ہے، یہ بادشاہ کی توہین ہے، تمہیں اس کی سزا ضرور بھگتنا پڑے گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا جو شاید اسی کے منتظر تھے۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے ولیم کے بیٹے والٹر کو پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے دور دو کھمبوں کے پاس لے گئے۔ انہوں نے اس کا ایک ہاتھ ایک کھمبے سے اور دوسرا دوسرے کھمبے سے باندھا، اس کے سر پر ایک سیب رکھا اور پیچھے ہٹ آئے۔ والٹر اب دو کھمبوں کے درمیان اس طرح بندھا کھڑا تھا کہ اس کے بازو کھلے ہوئے تھے لیکن وہ دائیں بائیں حرکت نہ کر سکتا تھا اور اس کے سر پر ایک سیب رکھا ہوا تھا۔

"آج میں تمہارا نشانہ دیکھنا چاہتا ہوں مسٹر کسان۔" گیسلر یہ سب کچھ کروانے کے بعد ولیم کی طرف مڑا۔ "اگر تم نے اس سیب کو پھڑکا دیا جو تمہارے بیٹے کے سر پر رکھا ہوا ہے تو میں تمہیں جانے دوں گا اور اگر ایسا نہ کر سکے تو یاد رکھو اسی ستون پر تمہیں پھانسی دی جائے گی جسے سلامی دینے سے تم نے انکار کیا ہے۔"

یہ بہت ہی ظالمانہ حکم تھا۔ سیب بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا اور ولیم اس سے کم از کم پچاس فٹ کی دوری پر کھڑا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر نشانہ خطا ہو جاتا تو اس کا پیارا بیٹا جان سے چلا جاتا لہٰذا اس نے خیر اسی میں دیکھی کہ گیسلر سے رحم کی بھیک مانگ لے۔

"دیکھیے جناب!" اس نے عاجزی سے کہا۔ "ہم سوئس لوگ آپ کے غلام ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جیسا چاہیں ہمارے ساتھ سلوک کریں۔ جو حکم آپ نے مجھے دیا ہے اس میں ہم دونوں کی رسوائی ہے۔ ولیم نے یہ کہتے ہوئے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری سزا معاف کر دیں اور ہمیں گھر جانے دیں۔"

یہ الفاظ اس نے بڑی نرمی سے کہے تھے اور اسے امید تھی کہ گیسلر اس کی درخواست قبول کرے گا لیکن جواب میں گیسلر تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر زور کا قہقہہ لگا کر بولا۔ "اب موت سامنے نظر آ رہی ہے تو رونے لگے ہو..... اور کرو حکم کی خلاف ورزی۔" یہ کہہ کر اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی میں سپاہی بھی شریک ہو گئے اور ولیم اچھا خاصا مذاق بن گیا۔

والٹر نے جب اپنے باپ کا یہ حال دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ باپ ہی کی طرح بہادر تھا اس نے ساری طاقت گلے میں جمع کی اور چلا کر بولا۔ "بالکل فکر نہ کیجیے بابا جان، میں بت کی طرح جم کر کھڑا ہوں گا، آپ ہمت کیجیے، مجھ پر بھروسا رکھیے بابا جان۔"

بیٹے کی بات سن کر ولیم کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے تھوڑی دیر رک کر کچھ سوچا اور دو تیر اپنے ترکش سے نکالے۔ ایک اپنے پاؤں کے قریب زمین میں گاڑ دیا اور دوسرا کمان میں چڑھا کر نشانہ لیا۔ تھوڑی دیر تک نشانے کو درست کیا اور تیر چھوڑ دیا۔

یہ منظر دیکھنے کے لیے سارا بازار جمع تھا۔ دکان داروں نے دکانیں اور گاہکوں نے خریداری بند کر کے ولیم کے گرد گھیرا بنا لیا تھا۔ ہر شخص سانس روکے والٹر کو دیکھ رہا تھا جو اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔

تیر زناٹے سے تیر کمان سے نکلا اور سیب کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ سب لوگوں نے واہ واہ کی اور تالیاں بجا کر ولیم کو داد دی انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ ولیم نے قوم کا سر بلند کر دیا ہے۔

دوسری طرف گیسلر کا منہ سیاہ ہو گیا تھا۔ اسے یہ سب کچھ پسند ہی نہیں آیا تھا۔ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی۔

"یہ دوسرا تیر تم نے کیوں نکالا تھا۔" اس نے زمین میں گڑے

تیر کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارے لیے۔" ولیم نے اسی آرام سے جواب دیا۔ "اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو جاتا تو میں تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔"

یہ سنتے ہی سپاہیوں نے تلواریں نکال لیں اور آن کی آن میں ولیم کو زمین سے لگا کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ گیسلر نے حکم دیا کہ اسے جھیل کے پار موجود بڑی جیل میں پہنچا دیا جائے۔ یہ اس سے بھی زیادہ ظالمانہ فیصلہ تھا۔ سارا بازار دیکھ رہا تھا کہ ولیم کا کچھ بھی قصور نہیں۔ گیسلر محض اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر رہا ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتے تھے کوئی اگر بولتا بھی تو اس کا انجام بھی وہی ہوتا جو ولیم کا ہوا تھا۔

یہ جھیل جس کی ابھی بات ہوئی آلڈروف کے بائیں طرف تھی اور کئی میل لمبی چوڑی تھی۔ جب سپاہی اسے کشتی میں ڈال کر لے جانے لگے تو ایک بہت ہی حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ کشتی کمانڈر جھیل کے راستے کو نہیں جانتا تھا اور پانی میں جگہ جگہ پتھر کی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں ڈر تھا کہ کہیں کشتی ان سے ٹکرا کر ٹوٹ نہ جائے۔ چناں چہ اس نے ولیم کی رسیاں کھول دیں اور اسے ہی حکم دیا کہ کشتی چلائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ولیم وہیں کا باشندہ تھا اور جھیل کے چپے چپے سے واقف تھا۔

ولیم نے حکم کی تعمیل کی اور بڑی احتیاط سے کشتی کو آگے بڑھانا شروع کیا لیکن ایک موقع پر جیسے ہی وہ کنارے کے ذرا قریب ہوا بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی میں ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ جتنی دیر تک سپاہی سنبھلتے وہ تیر کر خشکی تک پہنچنے میں کام یاب ہو گیا۔ اب وہ دوبارہ آزاد تھا جیسا کہ آلڈروف میں آنے سے پہلے تھا۔

گیسلر تک جب یہ خبر پہنچی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ قصبے کے ارد گرد کا سارا جنگل چھان مارا جائے اور کسی بھی طرح زندہ یا مردہ ولیم کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چناں چہ سپاہی ہر طرف پھیل گئے اور تلاش شروع ہو گئی اس طرح ولیم کی زندگی مزید تنگ ہو گئی۔

وہ سارا دن گھاٹیوں اور راتیں درختوں پر بسر کرتا۔ وہ اپنے گھر بھی نہ جا سکتا تھا کیوں کہ اس کی بیوی اور بچوں پر پہرہ مقرر کر دیا گیا تھا۔

ایک روز جھیل کے اس طرف سے سپاہیوں کا ایک دستہ خشکی پر اترا۔ وہ سب ولیم کو ڈھونڈ رہے تھے۔ گیسلر بھی ان کے ساتھ تھا بلکہ ان سب کی کمانڈ وہی کر رہا تھا۔ ولیم اس دوران درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا ہوا تھا۔ جیسے ہی گیسلر اس کے تیر کی زد میں آیا اس نے نشانہ باندھ کر تیر چلا دیا۔ تیر گیسلر کے گلے کو پھاڑتا ہوا گردن میں جا کر رک گیا۔ اسے موت بھی ایسی ملی کہ کوئی اس کی لاش پر دو آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔

جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ ہر شخص دوسرے کو مبارک باد دینے لگا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ہم لوگ کیوں بلاوجہ ان آسٹرویوں کا ظلم برداشت کر رہے ہیں کیوں نہ ولیم کی طرح ہی بہادری دکھائی جائے۔ چناں چہ آلڈروف کے لوگوں نے مسلح جدوجہد شروع کی اور اپنے قصبے کو آسٹروی سپاہیوں سے آزاد کروا لیا۔ اردگرد کے قصبوں تک جب یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے بھی ان کے دیکھا دیکھی آسٹرویوں کو اپنے علاقوں سے مار بھگایا۔ جلد ہی یہ تحریک پورے سوئزر لینڈ میں شروع ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ اتنا زور پکڑ گئی کہ آسٹریا کے بادشاہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ سوئزر لینڈ کو آزادی دے۔

وہ دن اور آج کا دن..... پتھے سو برس گزر چکے ہیں لیکن سوئس لوگ آج تک ولیم کی بہادری اور جرأت کو نہیں بھولے۔

یہ سب ہوا بھی تو اسی کی وجہ سے تھا۔ آج بھی جب ان کے علاقوں میں برف باری ہوتی ہے تو وہ بڑے مزے سے لحافوں میں دبک کر اپنے بچوں کو یہ کہانی سناتے ہیں۔ ☆☆☆

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلْحَسِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(سب کے لیے کافی ہو جانے والا)

اَلْحَسِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو کوئی اس کا ہو جاتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ مبارک نام تین مرتبہ آیا ہے۔ ہم سب لوگ اس مبارک نام کا ترجمہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں: ''سب کے لیے کافی ہو جانے والا۔'' اگر اس کے معنی کا یقین ہمارے دلوں میں بیٹھ گیا تو پھر ہمیں کوئی ڈر اور خوف نہیں رہے گا، کیوں کہ اللہ ہی میرے لیے کافی ہے۔

غیبی مدد

خفیہ سازش تیار ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد اسے عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کسی معاملے کے سلسلے میں بنو نضیر (ایک قبیلے کا نام ہے) کے پاس تشریف لے گئے تھے۔

انہوں نے آپ ﷺ کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں لگا لیا۔ عمرو بن جحش یہودی تیار تھا کہ دیوار کے پیچھے سے چڑھ کر پتھر کی ایک چٹان آپ ﷺ کی طرف لڑھکا دے اور آپ (نعوذ باللہ) شہید ہو جائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے اس برے ارادے کی خبر فرما دی۔ آپ ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ گئے اور ان کی ساری سازش خاک میں مل گئی۔

آپ ﷺ کے خلاف کافروں نے طرح طرح کی خفیہ سازشیں کیں۔ مگر انہیں شاید معلوم نہ تھا وہ ''اَلْحَسِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' اپنے پیارے محبوب کے لیے کافی ہے۔

ایک یہودی جس کا نام کعب بن اشرف تھا، اس نے ایک ناپاک تدبیر بنائی۔ وہ یہ کہ آپ ﷺ کو اپنے گھر میں بلا کر نعوذ باللہ قتل کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس خفیہ سازش کی بھی اطلاع فرما دی اور کافروں کی ہر تدبیر ناکام و نامراد ہو گئی۔

سات مرتبہ

ایک حدیث شریف میں ہے کہ: ''جو شخص صبح و شام سات مرتبہ یہ آیت پڑھ لے:

''حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔''

تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کی تمام فکروں کے لیے کافی ہو جاتے ہیں۔''

ترجمہ: میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

یاد رکھنے کی باتیں

1- ہم ''اَلْحَسِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کے علاوہ کسی سے بھی خوف نہ کھائیں، وہ ہر معاملے میں ہمیں کافی ہے۔

2- ہم کسی سے امید نہ لگائیں۔ صرف اسی پر بھروسا رکھیں۔ وہ ہر کام میں ہمارے لیے کافی ہے۔

3- جو دعا بتائی گئی ہے اسے روزانہ مانگیں اور دوسروں کو بھی اس کے فوائد بتائیں، خصوصاً وہ لوگ جو فکروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ☆☆☆

ننھے قارئین

بوجھو تو جانیں

1- پھوٹی قسمت پھوٹے بھاگ
گرمی میں بھی تاپے آگ

2- رہتی ہے وہ جال بچھائے
خود نہیں تھکتی سب کو تھکائے

3- چپ بیٹھا بور کرے
تھیٹر مارو شور کرے

4- اک پری ہے رنگ رنگیلی سی
کچھ سبز سی ہے کچھ نیلی سی
کچھ لال سی ہے کچھ پیلی سی
بارش میں نہا کر آتی ہے
پھر پل بھر میں چھپ جاتی ہے
بوجھو تو جانیں اس کا نام
دنیا میں کیا ہے اس کا کام

(میمونہ نوید، راول چنڈی)

5- کالا پن نیلی سیاہی لکھا لال کیسے؟

6- اونٹ بیٹھا زمین پر منہ ہے مشرق کی طرف دم ہوگی کس طرف

7- بیٹھے تو برا لگے ! کھڑا ہو تو چھوٹا

8- ایک تھا بابا لودھی ! جس کے سر پر بودی

9- نور پری ہے جادو گھر میں ! حاضر غائب ہو پل بھر میں
پہنے ہے وہ نور کا سایہ ، کر دے وہ جو سامنے آیا

(ثروت یعقوب، لاہور)

10- کالا ہے پر کوا نہیں
درخت پر چڑھتا ہے بندر نہیں
موٹا سر ہے ہاتھی نہیں
پتلی کمر ہے چیتا نہیں

11- چڑیا ہے اک بڑی نرالی
ٹک ٹک ٹک ٹک کرنے والی
گھنٹے بعد وہ ٹن ٹن گائے
گزرا وقت ہمیں بتلائے

جوابات: 1- پھوٹا 2- مکڑی 3- ڈھول 4- قوس قزح 5- ٹیکا لال 6- زمین کی طرف 7- کرکٹ 8- ترازو 9- لائٹ 10- ٹیکا 11- گھڑی

نقطے ملایئے

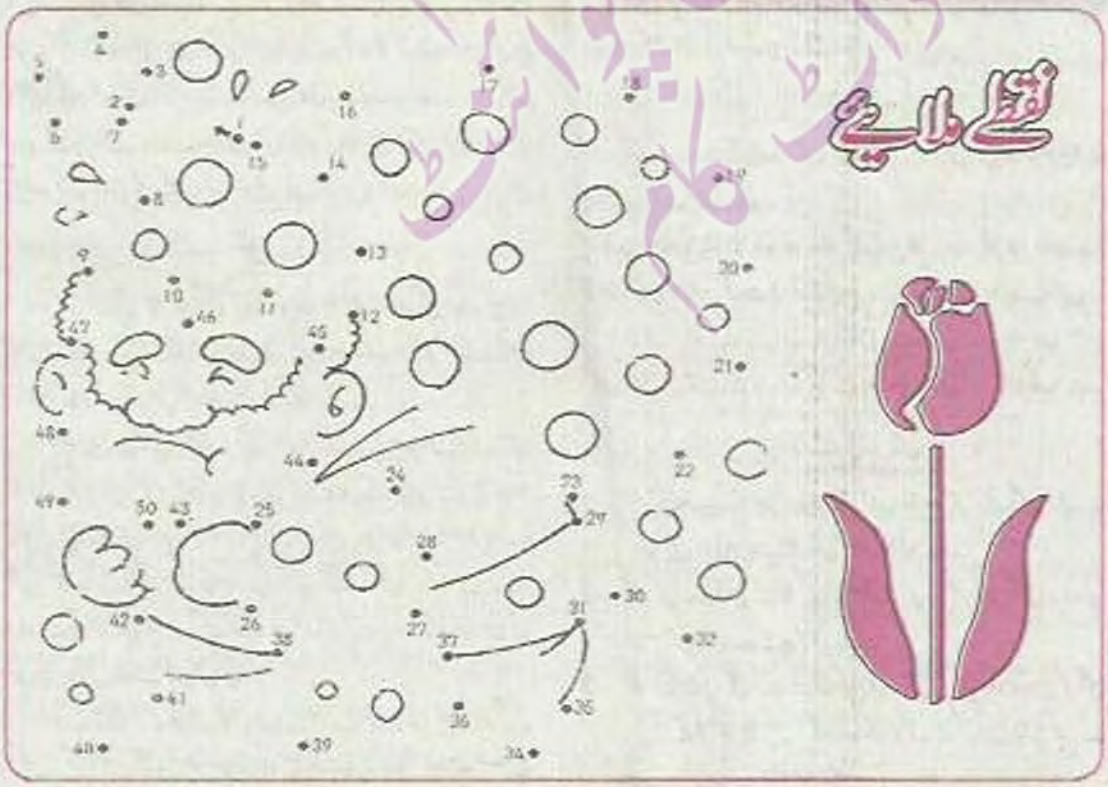

لاہور کے اقبال پارک میں ایک عظیم الشان مینار، پاکستان کی آزادی کی تحریک کی داستان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ مینار پاکستان ہے جو ہمیں مارچ 1940ء کے اس بے مثال اجلاس کی یاد دلاتا ہے جو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے ہر علاقے، شہر، گاؤں اور ریاست کا مسلم باشندہ اپنے حق کی آواز بلند کرنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس 27 ویں سالانہ اجلاس میں وہ قرارداد پیش ہوئی جس نے آگے چل کر ایک نئے آزاد اسلامی ملک پاکستان کی راہ ہموار کی۔ بالآخر 14 اگست 1947ء کو ہمارے بزرگوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں پاکستان حاصل کر لیا۔

بعد میں حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا کہ لاہور کے اسی اقبال پارک میں جہاں یہ عظیم الشان جلسہ ہوا تھا اور قرار داد پاکستان منظور ہوئی تھی، اس کی یادگار بنائی جائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ اس پارک کا اس سے پہلے نام "منٹو پارک" تھا۔ لارڈ منٹو انگریزی حکومت میں اہم عہدے پر رہے تھے۔ قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد اس کا نام بدل کر اقبال پارک، علامہ اقبالؒ پر رکھا گیا۔ اس جلسے کی یادگار مینار کی شکل میں تعمیر کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس کے سربراہ مختار مسعود تھے۔ وہ اس وقت لاہور کے کمشنر تھے۔ ان کے ہمراہ اس عظیم ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لیے اردو کے معروف افسانہ نگار اور کئی انسائیکلوپیڈیا کے مدیر سید قاسم محمود بھی تھے۔ یہ سب کی قومی ذمہ داری تھی جو بے حد خلوص کے ساتھ ادا کی گئی۔ یوں مینار پاکستان وجود میں آیا۔ اس مینار کی تعمیر کا حال خوب صورت نثر میں مختار مسعود نے اپنی کتاب "آواز دوست" کے پہلے باب میں تحریر کر دیا ہے۔ آپ جب بڑی کلاسوں میں پہنچیں تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے گا۔ اس کتاب میں مینار سے متعلق یہ اقتباس بار بار پڑھنے کے لائق ہے:

"اس برصغیر میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا، وہ مینار، قرار داد پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں، مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گردوارہ (سکھوں کی عبادت گاہ) اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہے تین صدیوں پر محیط ہے۔"

ہماری آج کی شخصیت مختار مسعود ہیں جو حکومت کے ایک اعلیٰ فرض شناس افسر تو تھے ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ادیب بھی تھے۔ ان کی نثر کو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ آواز دوست میں ستر (70) کے عشرے میں شائع ہوئی تو اس کے انداز بیاں اور زبان نے سب ہی کو متاثر کیا۔ مینار پاکستان کی تعمیر میں حصہ لینے کے بعد یہ شاہ کار کتاب وجود میں آئی۔ اس کتاب کا دوسرا باب بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس باب کو لکھتے وقت ان کے سامنے آٹو گراف بک پڑی تھی۔ علی گڑھ میں دوران تعلیم جو بھی بڑی شخصیت آئی، مختار مسعود نے ان سے آٹو گراف لیا۔ کئی سالوں بعد اس کا ورق کھولتے جاتے اور اس شخصیت کے بارے میں لکھتے جاتے۔ یوں اس کتاب کا دوسرا باب "قحط الرجال" وجود میں آیا۔ قحط الرجال کے معنی ہیں: "آدمیوں کا قحط یا کمی"۔

مختار مسعود 15 دسمبر 1926ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں 1877ء میں علامہ محمد اقبال پیدا ہوئے تھے۔ والد شیخ عطاء اللہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ سو مختار مسعود کی تعلیم کے لیے اسی درس گاہ کا انتخاب ہوا۔ انہوں نے پہلی جماعت میں داخلہ لیا اور یہیں سے 1942ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1944ء میں ایف اے میں پانچویں پوزیشن لے کر نمایاں رہے اور اسکالرشپ کے حق دار ٹھہرے۔ بی اے میں بھی کام یابی نے ان کے قدم چومے۔ اس بار ان کی پوزیشن سوم رہی۔ وہ اسکالرشپ کے ساتھ ساتھ گولڈ میڈل کے حق دار ٹھہرے۔ ایم اے انہوں نے معاشیات (اکنامکس) میں کیا اور یونی ورسٹی بھر اول پوزیشن لی اور گولڈ میڈل ایک بار پھر ان کے لیے لازم ٹھہرا۔ اس بار گولڈ میڈل دینے والی شخصیت سروجنی نائیڈو تھیں۔ ہندوستان بھر کی سیاست میں پہچانی جانے والی اس شخصیت نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" قرار دیا تھا۔ مختار مسعود نے گولڈ میڈل حاصل کرنے والی اس تصویر کو اپنے ڈرائنگ

روم کی زینت بنایا۔ یہاں یہ بات کم دل چسپ نہیں ہے کہ انہوں نے پہلی کلاس سے ایم اے تک تمام تر تعلیمی مراحل علی گڑھ میں قائم اس درس گاہ سے طے کیے، جسے سرسید احمد خان نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود قائم کیا تھا۔ اس تعلیمی ادارے سے محبت اور سرسید احمد خان سے انسیت زندگی بھران کا اثاثہ رہی۔

ان کے دوران تعلیم ہی ہندوستان بھر میں آزادی کی تحریکیں عروج پر تھیں۔ کانگریس نے اس دوران انگریزوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' مطلب یہ تھا کہ آپ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں اور تقسیم کا مرحلہ ہم اور مسلمان مل کر خود ہی حل کرلیں گے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ ہندوؤں کی اس چال سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اس کے جواب میں نعرہ لگایا: ''تقسیم کرو اور پھر جاؤ'' یعنی قائداعظم محمد علی جناحؒ ہندو ذہنیت کی مکاری سے واقف تھے۔ اس لیے وہ انگریزوں سے ہی تقسیم اور آزادی کے خواہش مند تھے۔ مختار مسعود، علی گڑھ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے فعال کارکن تھے۔ بعد میں وہ اس کے صدر رہے۔

قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اور اعلیٰ ملازمت کے لیے مقابلے کا امتحان پاس کر کے حکومتی مشینری کا حصہ بن گئے۔ دوران ملازمت وہ اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر رہے۔ انہوں نے اس دوران خوشاب، ملتان، کراچی، لاہور اور بہاول پور میں اپنی خدمات انجام دیں۔ کمشنر لاہور تھے جب ہی مینار پاکستان کی تعمیر کرانے کا سہرا ان کے سر پر سجا۔ اس کے علاوہ برکت علی محمد ہال کی مرمت اور توسیع بھی کرائی۔ جنگ ستمبر 1965ء کے شہید میجر راجا عزیز بھٹی کی جائے شہادت پر ایک یادگار عمارت بنوائی۔ میجر راجہ عزیز بھٹی 12 ستمبر 1965ء کو برکی کے مقام پر شہید ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ کئی محکموں میں سیکریٹری کے درجے کے فرائض بھی انجام دیے۔

ان کی تین اردو کتابوں نے بے حد شہرت پائی۔ ان میں پہلی کتاب ''آواز دوست'' ہے۔ اس میں صرف دو باب ہیں۔ پہلا مینار پاکستان اور دوسرا خط الرجال۔

ان کی دوسری کتاب کا نام ''سفر نصیب'' ہے۔ دوران ملازمت وہ کئی ملکوں کے دورے پر گئے اور ساتھ میں معلومات اور مشاہدات کے سہارے اس کتاب کو تخلیق کیا۔ ان کی نثر کا اندازہ ان چند جملوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

☆ دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑتا ہے، تاکہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند درکار ہے اور پیکر خاک کو ضبط کا مضبوط بند۔

☆ مسجد میں حاضری کے لیے تاجر کو اپنی سطح سے بلند ہونا پڑتا ہے اور اقتدار کی کرسی سے اتر کر نیچے آنا پڑتا ہے۔

مختار مسعود 1978ء سے 1982ء تک آر سی ڈی کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے تہران میں رہے۔ آر سی ڈی (Regional Co-operation for Development) علاقائی تعاون برائے ترقی کے ممبر پاکستان، ایران اور ترکی تھے۔ یہ عہدہ سفیر کے مرتبے کے برابر کا ہے۔ چار سال کے اس عرصے کے دوران انہوں نے ایران میں آنے والا انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو ملک بدر ہونا پڑا۔ ان کا اقتدار ماضی کا خواب ہوا، اور امام خمینی نے اقتدار سنبھالا۔ یہ ایران میں گذشتہ پانچ ہزار سال سے قائم بادشاہت کا خاتمہ تھا۔ وہ اس سارے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے اس سارے منظر کو اپنی خوب صورت نثر کے سہارے لکھا اور یوں ایک اور شاہ کار کتاب ''لوح ایام'' 1996ء میں وجود میں آئی۔ ناقدین (تنقید کرنے والے) کا دعویٰ ہے کہ لوح ایام کا شمار گذشتہ صدی کی چند بہترین کتاب میں کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ 1901ء سے 2000ء تک درمیانی عرصہ بیسویں صدی یعنی گذشتہ صدی کہلاتی ہے۔ چند جملے اس کے بھی پڑھ لیجیے:

☆ زندہ قومیں عمل اور جرأت سے پہچانی جاتی ہیں نہ کہ فرش اور فرنیچر سے۔

☆ زندہ قومیں اپنی تقدیر خود بناتی ہیں۔ کاتب تقدیر ان سے املا لیتا ہے بتا تیری رضا کیا ہے؟

☆ تاریخ میں اگر مگر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ یا تو ہوتی ہے یا نہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی زبان میں بھی دو کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے خطوط کی کتاب ہے اور دوسری مغربی پاکستان کی سرزمین کے جائزے سے متعلق ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک کالج کے پرنسپل رہے۔ ان کا انتقال 15 اپریل 2017ء کو ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی ایک اور کتاب ''حرف شوق'' منظر عام پر آئی۔ ان کے فن اور فکر پر یونی ورسٹی سطح کے مقالاجات لکھے گئے اور کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

☆☆☆

ا	ب	ج	ل	د	ن	گ	ع	غ	س
ص	ص	ر	گ	ج	ط	ن	ے	ٹ	ی
ک	ش	ک	ی	ڑ	ژ	ٹ	ا	ا	ک
ا	ط	ظ	د	م	ا	غ	ن	ن	گ
ن	ص	چ	خ	ع	د	ذ	ڑ	گ	ل
م	ض	و	س	د	ض	ع	د	ل	ج
ا	ث	ز	ظ	ہ	گ	ک	ع	ن	ط
ی	ث	ا	خ	ت	ل	ا	ش	ی	ا
پ	ج	ب	ا	ٹ	ک	ن	ل	غ	ڑ
ن	پ	ی	ٹ	ژ	س	س	د	ص	ض

آپ نے حروف ملا کر دس جسمانی اعضاء کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

دماغ، دل، جگر، ٹانگ، کان، ناک، بازو، پیٹ، معدہ، جلد

ارمغانِ حجاز سے ایک حکایت

غنی کشمیری

ملا محمد طاہر غنی کشمیری، کشمیر میں بے نظیر کا شاعر بے نظیر تھا۔ اس کا دستور تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو گھر کا دروازہ بند رکھتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے اس سے کہا۔

''اے نوائے بلبل صفیرا تیرے اس طرزِ عمل پر ہر کسی کو تعجب ہوتا ہے کہ تو گھر میں ہوتا ہے تو دروازہ بند رکھتا ہے اور جب باہر جاتا ہے تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا ہے، حالاں کہ لوگوں کا دستور تو یہ ہے کہ جب وہ گھر سے باہر جاتے ہیں تو گھر کو تالا لگا کر جاتے ہیں کہ کہیں ان کی عدم موجودگی میں کوئی چور گھر میں گھس کر گھر کا قیمتی سامان نہ چرا لے۔ تیرا دستور عامل لوگوں کے بالکل برعکس ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''

غنی کشمیری نے جواب دیا۔

''میرے دوست! لوگوں کا میرے طرزِ عمل پر حیران ہونا ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ میں جو کچھ کرتا ہوں بالکل درست کرتا ہوں۔ میرے گھر میں سوائے میرے اور قیمتی سامان کون سا ہے، جس کی حفاظت کی فکر کی جائے۔ غنی جب تک اپنے گھر میں ہوتا ہے، اس کے گھر میں اس کی اپنی ذات کی متاعِ گراں موجود ہوتی ہے اور وہ اس کی حفاظت کے خیال سے اپنے گھر کا دروازہ بند کیے رکھتا ہے اور جب وہ گھر سے باہر چلا جاتا ہے تو پھر گھر میں ایسی کون سی قیمتی چیز باقی رہ جاتی ہے جس کی حفاظت کی جائے، اس لیے وہ گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس نظم میں کشمیر جنت نظیر کے غیرت مند، خوددار، قناعت پسند شاعر اور درویش ملا محمد طاہر غنی کشمیری کی اس عادت کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔

غنی کشمیر شیخ محسن خانی کا شاگرد تھا۔ تحصیل علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے 1060 ہجری میں شاعری شروع کی اور بہت جلد اپنے ہم عصر شعراء میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ جس طرح حکیم مومن خاں مومن کے متعلق مرزا غالب نے کہا تھا کہ وہ میرا سارا دیوان لے لیں اور اپنا یہ شعر مجھے دے دیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی طرح مرزا صاحب غنی کشمیری کے بہت قدردان تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ کاش غنی میرا سارا دیوان مجھ سے لے لیتا اور

اپنا یہ شعر مجھے دے دیتا۔

حُسن سبزے خطِ مرا کرد اسیر
دام ہم رنگِ زمیں بُود، گرفتار شدم

جس طرح خواجہ حافظ شیرازی کی شہرت شیراز سے سرزمین بنگالہ تک پہنچ گئی تھی، اسی طرح غنی کشمیری کی شاعری نے اہل ایران سے بھی اپنا لوہا منوا رکھا تھا۔ چناں چہ مشہور ہے کہ ایران کے ایک شخص نے ایک مصرع کہا۔

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید
(ترے لباس سے بوئے کباب آتی ہے)

وہ اس مصرع کو لے کر یکے بعد دیگرے ایران کے تمام مشہور و معروف شعراء کے پاس گیا کہ وہ اس مصرع پر گرہ لگا کر شعر مکمل کریں، مگر کوئی شاعر بھی اس مصرع پر گرہ لگا کر شعر مکمل نہ کر سکا۔ اس پر اس شخص نے ایران سے کشمیر کا سفر اختیار کیا اور سفر کی صعوبتیں اٹھاتا ہوا غنی کشمیری کے گھر پہنچا۔ غنی کشمیری نے اپنے ایرانی مہمان کو گھر میں بٹھایا، اس کی خاطر تواضع کے لیے کچھ سامان مہیا کرنے کی خاطر باہر چلا گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کام میں غنی کشمیری کو خاصی دیر ہو گئی۔ مہمان بیٹھے بیٹھے اور انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تو اس نے قلم دان سے قلم اٹھایا، ایک پرزہ کاغذ پر مصرع لکھا اور اسے قلم دان کے پاس رکھ کر وہاں سے چلا گیا۔

خاصی دیر بعد غنی کشمیری واپس آیا تو دیکھا کہ مہمان غائب ہے۔ قلم دان کی طرف نگاہ کی تو وہاں کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ غنی کشمیری نے وہ پرزہ اٹھا لیا کہ شاید مہمان جاتے ہوئے کوئی پیغام چھوڑ گیا ہو۔ دیکھا تو اس پر ایک مصرع لکھا تھا:

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

غنی کشمیری نے اسی وقت قلم اٹھایا اور اس پر گرہ لگا کر شعر مکمل کر دیا۔

کدام سوختہ جاں دست زد بہ دامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید!

ترجمہ:

یہ کون سوختہ جاں چھو گیا ترا دامن
ترے لباس سے بوئے کباب آتی ہے!

غنی کشمیری اپنے دور کے عام شعرا کے برعکس انتہائی غیور، خوددار اور قناعت پسند تھا۔ مرزا بیدل کی طرح وہ بھی ساری عمر کسی امیر یا بادشاہ کے دروازے پر نہیں گیا۔ شہنشاہ عالم گیرؒ نے اس کی قابلیت کا حال سنا تو سیف خاں گورنر کشمیر کو لکھا کہ غنی کو ہمارے پاس بھیج دو۔ سیف خاں نے غنی کشمیری کو طلب کیا اور بادشاہ کے حکم سے آگاہ کیا۔ غنی کشمیری نے کمال استغنا سے جواب دیا۔

"بادشاہ کو لکھ بھیجو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے، اس لیے باریابی کے لائق نہیں ہے۔"

سیف خاں نے کہا۔ "میں آپ ایسی بیگانہ روزگار شخصیت کے لیے یہ تضحیک آمیز الفاظ کیسے لکھ سکتا ہوں؟ اس کے علاوہ آپ تو باہوش و حواس ہیں۔"

گورنر کی یہ بات سن کر غنی نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔"

یہ الفاظ کہہ کر غنی کشمیری اپنے گھر واپس آیا اور اسی دن اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا۔ تین چار روز اس کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے صرف چالیس سال کی عمر میں 1079 ہجری میں وفات پائی اور سری نگر میں مدفون ہوا۔

غنی کشمیری کی طبیعت میں علائق دنیا سے کمال بے تعلقی پائی جاتی تھی۔ دنیا اور دنیاوی ساز و سامان کی رغبتوں سے وہ قطعاً بے نیاز تھا۔ اس لحاظ سے وہ معنوی طور پر بھی غنی تھا۔ اپنی بابت اس نے خود کہا ہے۔

سعیِ روزی برنمی دارد مرا از جائے خویش
آبرو چوں شمع می ریزم ولے بر پائے خویش

یعنی مرزا غالب کے الفاظ میں۔

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

اس لیے علامہ اقبالؒ جاوید نامہ میں غنی کشمیری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

شاعرِ رنگیں نوا، طاہر غنی
فقر او باطن غنی، ظاہر غنی

☆☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ کس شہر میں پہلی مرتبہ قرآن پاک کی طباعت حضرت عثمانؓ نے کی تھی؟

i۔ کوفہ ii۔ حبشہ iii۔ یمن

2۔ روشنی کی رفتار فی سیکنڈ کتنی ہے؟

i۔ 18000 میل ii۔ 18200 میل iii۔ 186000 میل

3۔ "آئن سٹائن" کس مشہور سائنس دان کو کہا جاتا ہے؟

i۔ ایڈیسن ii۔ نیوٹن iii۔ آئن سٹائن

4۔ چین کا قدیم نام کیا ہے؟

i۔ Cothy ii۔ Cathy iii۔ Ceathy

5۔ کس نام ور طبیب نے بتایا کہ کسی شخص کو ایک مرتبہ چیچک نکل آئے تو آئندہ ہمیشہ کے لیے وہ اس مرض سے مامون ہو جاتا ہے؟

i۔ بوعلی سینا ii۔ ابن بیطار iii۔ ابن رشد

6۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ہانگ درا سے لیا گیا ہے۔ مکمل کیجیے:

جتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ .....

7۔ مولانا شیر علی خاں نے مولانا شبلی نعمانی کی کتاب "الفاروق" کا کس زبان میں ترجمہ کیا؟

i۔ فارسی ii۔ انگریزی iii۔ عربی

8۔ پاکستان کی سب سے بڑی یونی ورسٹی کون سی ہے؟

i۔ سندھ یونی ورسٹی ii۔ زرعی یونی ورسٹی iii۔ پنجاب یونی ورسٹی

9۔ شہد کی مکھی کی کتنی آنکھیں ہوتی ہیں؟

i۔ 7 آنکھیں ii۔ 8 آنکھیں iii۔ 9 آنکھیں

10۔ مختار مسعود کی کتاب "لوحِ ایام" کس سن میں وجود میں آئی؟

i۔ 1996ء ii۔ 1997ء iii۔ 1998ء

جوابات علمی آزمائش جنوری 2018ء

1۔ صاحب الوسادۃ 2۔ نمک کا تیزاب 3۔ آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا 4۔ بصرہ 5۔ 355 فٹ 6۔ ظہیر الدین بابر 7۔ ہیروشیما 8۔ ابوریحان البیرونی 9۔ امریکہ 10۔ ملتان

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ راج ولی خان، نوشہرہ (150 روپے کی کتب)

☆ محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا (100 روپے کی کتب)

☆ محمد ابوبکر عارف قادری، کاموکی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

عزیر ان خالد، کمالیہ۔ عدن سجاد، جھنگ۔ وجیہہ رجب، اسلام آباد۔ آیت اللہ ورک، لاہور۔ علینا اختر، کراچی۔ محمد اسد اللہ قادری، محمد صفدان رضا قادری، حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔ قرعین زمان، کرک۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ محمد سالار، گوجر خان۔ مرا قریشی، گجرات۔ لائبہ فاطمہ، لاہور۔ سندس آسیہ، کراچی۔ محمد عمر فاروق، لاہور۔ محمد نعمان رضا قادری، کاموکی۔ ولید اشرف، لاہور۔ محمد ابراہیم، اسلام آباد۔ آمنہ مختار، زینت ارشد، رمیشہ اکبر، حمیرا عبدالغفار، زاہرہ بتول، شمائم رشید، انعم مشتاق، لائبہ فرید، شبانہ شریف، تیزہ الیاس، شاہ لبھا، آسیا عمر، نائلہ رفیق، لائبہ سلیم، سعدیہ فشاء، عرشیہ حیدر، انعم امانت، لاہور۔ ثمن الیاس، گجرات۔ زہرہ بتول، کراچی۔ نعمان اعجاز، منڈی بہاؤ الدین۔ تنزیلہ رمضان، لاہور۔ صوفیہ شاہد، کوئٹہ۔ تہمینہ دورانی، بھکر۔ سائرہ بتول، جھنگ۔ طلحت خان، خانیوال۔ تنویر احسان، شیخوپورہ۔ ضیاء الدین، پشاور۔ طیب رحمان، کھاریاں۔ صالحہ صنم، دریا خان۔ ضمیر عباس، جہلم۔ محمد احمد، چکوال۔ کظیمہ زہرہ، لاہور۔ محمد حسن، کاموکے۔ نور فاطمہ، سانی وال۔ بشریٰ احسان، راول پنڈی۔ طٰہٰ حسن، کراچی۔ ثمین زہرہ، پشاور۔ فرح ناز، لاہور۔ صفیہ سراج، رقیہ طلعت، میاں والی۔ عمران خان، کوئٹہ۔ جاذب حسین، گجرات۔ طوبیٰ نعیم، گوجرانوالہ۔ محمد اکبر، کراچی۔ آسیہ جبار، اسلام آباد۔ ارشد ارسلان، ایبٹ آباد۔ کشف ارشد، فیصل آباد۔ عبدالہادی عارف، گجرات۔ ادریس حسیم، گوجرانوالہ۔ محمد حسن، بہاول پور۔ کاشف ارشد، جھنگ۔ قاسم عبداللہ، وزیر آباد۔ جنید اکرم، کاموکے۔ عبداللہ رفیق، لاہور۔ سنبلہ اکبر، راول پنڈی۔

ویت نام کے آدم خور

مقبول جہانگیر

تیسرا اور آخری حصہ

میں اپنے ایک دوست کی فرمائش پر شہد جمع کرنے کے لیے اس جنگل میں گیا۔ میرے پاس اس خنجر کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے اپنا جسم ایک موٹے کمبل میں چھپا رکھا تھا اور بارہ فٹ اونچی بانس کی بنی ہوئی سیڑھی میرے کندھوں پر رکھی تھی۔ اس جنگل میں شہد کی مکھیوں کے چھتے کثرت سے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگلی پھلوں کے بے شمار درخت بھی ہیں اور یہ ساری چیزیں ریچھ کی پسندیدہ غذا ہیں، اس لیے ریچھوں نے وہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ شیروں کو ادھر جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، کبھی کوئی بھولا بھٹکا شیر ادھر جا نکلتا، تو ریچھ مل جل کر اس پر بلہ بول دیتے اور پھر ان کی مدد کے لیے ہاتھی بھی آ جاتے۔

صبح کا وقت تھا..... مزے مزے میں چلا جا رہا تھا کہ میں نے ایک درخت پر بہت بڑا چھتہ دیکھا جو ابھی تک ریچھوں کی یلغار سے محفوظ تھا۔ چھتے کی اونچائی زمین سے تیس فٹ ہو گی؟ بہرحال میں نے درخت کے تنے کے ساتھ سیڑھی لگائی..... کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور منہ چھپا کر اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی میں نے سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک طرف سے دو ریچھ آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک ہتھنی جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی اور ہتھنی کے ساتھ اس کا چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جانور "تفریح" کے لیے ادھر آئے ہیں۔

میں نے جلدی سے درخت کی شاخوں اور پتوں میں چھپنے کی کوشش کی، مگر ریچھ اور اس کی مادہ نے مجھے دیکھ لیا اور وہ دوڑتے دوڑتے فوراً اپنے پچھلے پیروں کے بل کھڑے ہو گئے اور چیخنے لگے۔ ہتھنی بھی رکی اور سونڈ اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ میں نے دل میں سوچا کہ آج تو بے موت مرے..... فرار کی کوئی راہ میرے سامنے نہ تھی..... اوپر شہد کی ہزارہا مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور نیچے ہتھنی اور ریچھ راستہ روکے کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد دونوں ریچھ درخت کے نزدیک آ گئے اور انہوں نے اس کے گرد چکر لگایا اور سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے، مگر میں ان کی پہنچ سے باہر تھا۔ دفعتہً چھتے سے ایک زناٹے دار آواز میں مکھیاں اڑیں اور ریچھوں سے چمٹ گئیں۔ کچھ مکھیوں نے ہتھنی اور اس کے بچے پر حملہ کر کے انہیں درخت سے پرے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی مکھیوں نے میری طرف توجہ نہ کی تھی، شاید اس لیے کہ میں شاخوں کے سہارے بے حس و حرکت دبکا بیٹھا تھا۔ موقع پا کر میں نے چھتہ توڑ دیا اور اچھی مقدار میں شہد اس ڈبے میں جمع کر لیا جسے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

مکھیوں کے بروقت "حملے" کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہتھنی اور ریچھ گھبرا کر ایک طرف بھاگ اٹھے میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھسلتا

ہوا درخت کے تنے سے زمین پر اترا، سیڑھی الٹھائی اور جدھر سے آیا تھا، ادھر چل پڑا۔ ابھی میں بمشکل دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ ایک درخت کے عقب سے ریچھ اور اس کی مادہ برآمد ہوئے اور انہوں نے راستہ روک لیا۔ میں نے جان بچانے کے لیے شہد کا ڈبا ان کی طرف پھینک دیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ وہ ڈبے کی طرف جھپٹے اور شہد چاٹنے لگے۔ میں الٹے پاؤں ایک چکر کاٹ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ایک جھاڑی میں پناہ لی، لیکن شیر کے غرانے کی آواز سنی، تو ہوش اڑ گئے۔ ایک قوی ہیکل اور جوان شیر جھاڑیوں میں پڑا سو رہا تھا۔ میری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ میرے اور اس کے درمیان پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے میری طرف نگاہ غلط انداز ڈالی اور انگڑائی لیتا ہوا جھاڑی سے نکلا اور اسی طرف چلا جدھر سے میں آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کا ریچھوں سے آمنا سامنا ہوگا۔ آپ مجھے بے وقوف کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ فوراً ہی میں بھی شیر کے تعاقب میں چلا اور موقع پاتے ہی ایک درخت پر چڑھ گیا۔ شیر کی بو پا کر ریچھوں کے جوڑے نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جنگل کے بادشاہ پر ان کی نظر پڑی جس کی دم آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شیر کا ارادہ جنگ کرنے کا نہ تھا، لیکن ریچھوں نے غالباً اسے شیر کی کمزوری سمجھا اور غراتے، دانت دکھاتے آگے بڑھے۔ شیر نے دائیں بائیں دیکھا، اونچی اونچی جھاڑیاں دونوں طرف کھڑی تھیں۔ اتنے میں ریچھ شیر کے نزدیک پہنچ گئے۔ شیر ایک لمحے کے لیے اس صورت حال سے خوف زدہ ہوا، لیکن فوراً ہی اس نے جھلا کر دایاں پنجہ نر ریچھ کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ ریچھ قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا اور اس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ اتنے میں اس کی مادہ شیر پر جھپٹی اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ شیر کی گرج سے جنگل کی زمین کانپ رہی تھی اور ادھر ریچھ بپھرے ہوئے چیخ رہے تھے۔ نر ریچھ اگرچہ شیر کے پہلے ہی وار سے شدید زخمی ہو چکا تھا لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ دوبارہ شیر پر حملہ آور ہوا۔ تین چار منٹ تک ان کی ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ تینوں خون میں نہا گئے۔ مجھے اس روز ریچھوں کی قوت اور طیش کا صحیح اندازہ ہوا، تاہم شیر کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ شیر لہولہان ہونے کے باوجود اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹا جب تک اس نے اپنے نوکیلے پنجوں اور دانتوں سے نر ریچھ کی بوٹیاں نہ اڑا دیں، پھر وہ ہانپتا ہوا ایک طرف چلا، لیکن مادہ ریچھ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

میں درخت پر بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا کہ مادہ ریچھ نے ایک عجیب سی حرکت کی، وہ منہ اوپر اٹھا کر چند لمحوں تک چیختی رہی جیسے کسی کو مدد کے لیے پکار رہی ہو، پھر دوڑتی ہوئی ایک طرف غائب ہو گئی۔ شیر جھاڑیوں میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ اس نے ریچھ کو بری طرح مارا تھا۔ ریچھ کی لاش مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مادہ ریچھ برادری والوں کو بلانے گئی ہے۔ ان کا قاعدہ ہے کہ کوئی ریچھ حادثے کا شکار ہو کر مر جاتے تو دوسرے ریچھ فوراً وہاں پہنچ کر انسانوں کی طرح روتے اور بین کرتے ہیں، پھر لاش اٹھا کر ایک خاص جگہ لے جاتے اور دفن کر دیتے ہیں۔

دفعتہ ہاتھی کی چنگھاڑ سے جنگل تھرا اٹھا۔ آواز میرے دائیں جانب سے آئی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دیوہیکل ہاتھی جھومتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے مادہ ریچھ چلی آ رہی تھی۔ شیر جھاڑیوں میں بیٹھا خاموشی سے ہاتھی کو دیکھتا رہا۔ مادہ نے مردہ ریچھ کو اچھی طرح سونگھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ہاتھی مسلسل چنگھاڑتا ہوا درختوں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیر کو جنگ کے لیے للکار رہا ہے۔ عین اس وقت شیر جھاڑیوں میں سے غراتا ہوا نکلا اور ہاتھی کی طرف لپکا۔ اس نے یہ حملہ اچانک کیا تھا۔ ہاتھی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ شیر نے چھلانگ لگائی اور ہاتھی کی پیشانی پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ ہاتھی درد سے بے تاب ہو کر گھوما اور اس نے زبردست جھٹکے سے شیر کو فضا میں اچھال دیا۔ شیر کمر کے بل زمین پر گرا اور دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ ہاتھی اپنے حریف کی طرف دوڑا اور اس کی ٹانگ سونڈ میں پکڑ لی، پھر اپنا کئی من وزنی پیر اس پر رکھ کر آناً فاناً شیر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ حریف کے اس طرح مارے جانے پر مادہ ریچھ خوشی سے چھاتی پیٹنے لگی، پھر میرے دیکھتے دیکھتے ہاتھی نے نہایت آرام سے ریچھ کی لاش سونڈ میں پکڑی اور گھنے جنگل میں چلا گیا.....''

چام کی زبانی یہ واقعہ سن کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی۔ جنگل کی دنیا بڑی نرالی ہے اور یہاں اس قسم کے واقعات پیش آنا کوئی عجوبہ نہیں، البتہ بہت کم شکاری ایسے ہیں جو اپنی آنکھوں سے یہ تماشے دیکھتے ہیں۔ چام نے میری دل چسپی کو بھانپ لیا اور کئی

ہوا درخت کے تنے سے زمین پر اترا، سیڑھی اٹھائی اور جدھر سے آیا تھا، ادھر چل پڑا۔ ابھی میں بمشکل دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ ایک درخت کے عقب سے ریچھ اور اس کی مادہ برآمد ہوئے اور انہوں نے راستہ روک لیا۔ میں نے جان بچانے کے لیے شہد کا ڈبا ان کی طرف پھینک دیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ وہ ڈبے کی طرف جھپٹے اور شہد چاٹنے لگے۔ میں الٹے پاؤں ایک چکر کاٹ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ایک جھاڑی میں پناہ لی، لیکن شیر کے غرانے کی آواز سنی، تو ہوش اڑ گئے۔ ایک قوی ہیکل اور جوان شیر جھاڑیوں میں پڑا سو رہا تھا۔ میری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ میرے اور اس کے درمیان پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے میری طرف نگاہ غلط انداز ڈالی اور انگڑائی لیتا ہوا جھاڑی سے نکلا اور اسی طرف چلا جدھر سے میں آیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کا ریچھوں سے آمنا سامنا ہوگا۔ آپ مجھے بے وقوف کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ فوراً ہی میں بھی شیر کے تعاقب میں چلا اور موقع پاتے ہی ایک درخت پر چڑھ گیا۔ شیر کی بو پا کر ریچھوں کے جوڑے نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جنگل کے بادشاہ پر ان کی نظر پڑی جس کی دم آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شیر کا ارادہ جنگ کرنے کا نہ تھا، لیکن ریچھوں نے غالباً اسے شیر کی کمزوری سمجھا اور غراتے، دانت دکھاتے آگے بڑھے۔ شیر نے دائیں بائیں دیکھا، اونچی اونچی جھاڑیاں دونوں طرف کھڑی تھیں۔ اتنے میں ریچھ شیر کے نزدیک پہنچ گئے۔ شیر ایک لمحے کے لیے اس صورت حال سے خوف زدہ ہوا، لیکن فوراً ہی اس نے جھلا کر دایاں پنجہ نر ریچھ کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ ریچھ قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا اور اس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ اتنے میں اس کی مادہ شیر پر جھپٹی اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ شیر کی گرج سے جنگل کی زمین کانپ رہی تھی اور ادھر ریچھ بپھرے ہوئے چیخ رہے تھے۔ نر ریچھ اگرچہ شیر کے پہلے ہی وار سے شدید زخمی ہو چکا تھا لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ دوبارہ شیر پر حملہ آور ہوا۔ تین چار منٹ تک ان کی ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ تینوں خون میں نہا گئے۔ مجھے اس روز ریچھوں کی قوت اور طیش کا صحیح اندازہ ہوا، تاہم شیر کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ شیر لہولہان ہونے کے باوجود اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹا جب تک اس نے اپنے نوکیلے پنجوں اور دانتوں سے نر ریچھ کی بوٹیاں نہ اڑا دیں، پھر وہ ہانپتا ہوا ایک طرف چلا، لیکن مادہ ریچھ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

میں درخت پر بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا کہ مادہ ریچھ نے ایک عجیب سی حرکت کی، وہ منہ اوپر اٹھا کر چند لمحوں تک چیختی رہی جیسے کسی کو مدد کے لیے پکار رہی ہو، پھر دوڑتی ہوئی ایک طرف غائب ہو گئی۔ شیر جھاڑیوں میں بیٹھا اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ اس نے ریچھ کو بری طرح مارا تھا۔ ریچھ کی لاش مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مادہ ریچھ برادری والوں کو بلانے گئی ہے۔ ان کا قاعدہ ہے کہ کوئی ریچھ حادثے کا شکار ہو کر مر جاتے تو دوسرے ریچھ فوراً وہاں پہنچ کر انسانوں کی طرح روتے اور بین کرتے ہیں، پھر لاش اٹھا کر ایک خاص جگہ لے جاتے اور دفن کر دیتے ہیں۔

دفعتہً ہاتھی کی چنگھاڑ سے جنگل تھرا اٹھا۔ آواز میرے دائیں جانب سے آئی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دیوپیکر ہاتھی جھومتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے مادہ ریچھ چلی آ رہی تھی۔ شیر جھاڑیوں میں بیٹھا خاموشی سے ہاتھی کو دیکھتا رہا۔ مادہ نے مردہ ریچھ کو اچھی طرح سونگھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ہاتھی مسلسل چنگھاڑتا ہوا درختوں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیر کو جنگ کے لیے للکار رہا ہے۔ عین اس وقت شیر جھاڑیوں میں سے غراتا ہوا نکلا اور ہاتھی کی طرف لپکا۔ اس نے یہ حملہ اچانک کیا تھا۔ ہاتھی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ شیر نے چھلانگ لگائی اور ہاتھی کی پیشانی پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ ہاتھی درد سے بے تاب ہو کر گھوما اور اس نے زبردست جھٹکے سے شیر کو فضا میں اچھال دیا۔ شیر کمر کے بل زمین پر گرا اور دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ ہاتھی اپنے حریف کی طرف دوڑا اور اس کی ٹانگ سونڈ میں پکڑ لی، پھر اپنا کئی من وزنی پیر اس پر رکھ کر آناً فاناً شیر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ حریف کے اس طرح مارے جانے پر مادہ ریچھ خوشی سے چھاتی پیٹنے لگی، پھر میرے دیکھتے دیکھتے ہاتھی نے نہایت آرام سے ریچھ کی لاش سونڈ میں پکڑی اور گھنے جنگل میں چلا گیا۔۔۔۔"

چام کی زبانی یہ واقعہ سن کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی۔ جنگل کی دنیا بڑی نرالی ہے اور یہاں اس قسم کے واقعات پیش آنا کوئی عجوبہ نہیں، البتہ بہت کم شکاری ایسے ہیں جو اپنی آنکھوں سے یہ تماشے دیکھتے ہیں۔ چام نے میری دل چسپی کو بھانپ لیا اور کئی

ہے اور لاش دیکھتے ہی اسے چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ فوراً ہی اوپر سے شہتیر گرتا ہے اور شیر کی کمر توڑ دیتا ہے۔

تیسرا طریقہ نہایت حیران کن اور زود اثر ہے۔ ایک مضبوط کمان درخت سے باندھ دی جاتی ہے اور نہایت نوکیلے سرے کا ہلکا نیزہ اس میں اٹکایا جاتا ہے۔ یہ نیزہ ذرا سے اشارے پر بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح کمان سے چھوٹتا ہے اور درندے کے جسم میں کھب جاتا ہے۔ ایسی کمانیں شیر کی گزرگاہوں پر نہایت چابک دستی اور فن کارانہ مہارت سے لگائی جاتی ہیں اور جوں ہی شیر زمین پر پڑی ہوئی ڈور پر پیر رکھتا ہے ڈور الجھ کر تن جاتی ہے اور نیزہ کمان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کمان کی اونچائی اور شیر سے اس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی پھندا لگایا جاتا ہے۔ نیزہ شیر کی گردن یا پیٹ میں جا لگے، تو فوراً مر جاتا ہے لیکن ٹانگ یا کندھے پر لگے، تو فوراً نہیں مرتا بلکہ کئی روز بعد سسک سسک کر جان دیتا ہے۔

یہ تمام ترکیبیں عموماً غیر آدم خور شیروں کو مارنے کے لیے آزمائی جاتی ہیں لیکن آدم خوروں کے شکار میں انہیں زیادہ کام میں نہیں لایا جاتا، کیوں کہ آدم خور اپنی ہوشیاری اور چالاکی کے باعث ان پھندوں میں نہیں آتا، البتہ آدمی اور عورتیں ان کے ذریعے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ گاؤں تقریباً خالی پڑا تھا اور ہزاروں افراد دریا پار رہنے لگے تھے، اس لیے ان تدبیروں پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ چام نے چند آدمیوں کو گڑھے کھودنے، کمانیں اور نیزے تیار کرنے اور درختوں پر شہتیر لٹکانے کی ہدایات دیں۔ دو دن کے اندر اندر ہم نے ان تمام مقامات پر جہاں آدم خوروں کے نمودار ہونے کا امکان تھا، گڑھے تیار کرا دیے درختوں پر کمانیں لگوا دیں اور کئی کئی شہتیروں کے مچان بھی بندھوا دیے جو ذرا سے اشارے پر نیچے آن پڑتے تھے۔ چام نے تیسرے دن چند مریل سے مویشی پکڑ کر ہلاک کیے اور ان کی لاشیں درختوں سے لٹکا دیں۔ اب ہم بے صبری سے نتائج کا انتظار کرنے لگے۔

سب سے پہلے اندھا شیر گڑھے میں گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ کئی سلاخیں اس کی گردن کے پار ہو گئی تھیں اس راستے پر کچھ دور ہٹ کر ایک اور گڑھا بھی بنا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی درندہ نہیں گرا۔ جس گڑھے میں اندھا شیر گرا تھا، اس کے چاروں طرف نرم نرم مٹی پر پنجوں کے تازہ نشانات بھی دکھائی دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ چاروں ادھر سے گزر رہے تھے کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر وہ یقیناً خبردار ہو گئے تھے کیوں کہ تین دن اور گزر گئے دوسرا حادثہ نہ ہوا۔ دو مقامات پر کمانوں سے نیزے بھی نکل گئے تھے لیکن آدم خوروں کو زخمی کرنے کے بجائے یہ نیزے سامنے کے درختوں میں پیوست تھے۔ غالباً چام نے فاصلے کا اندازہ غلط کیا تھا۔ جارج اس صورت حال سے سخت نالاں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ طریقے شکار کی روح کے خلاف ہیں۔ ہمیں کم از کم شیروں سے چوہوں اور گیدڑوں کا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سن کر

مجھے بھی ندامت ہوئی اور میں نے چام سے کہہ دیا کہ درختوں سے شہتیر اتروائے اور گڑھوں کا منہ بند کر دے۔ ہم اپنی رائفلوں سے آدم خوروں کا مقابلہ کریں گے۔

اس روز دوپہر کے وقت ہم جنگل میں گھوم پھر کر ان جگہوں کا معاینہ کر رہے تھے جہاں ہم نے پھندے لگائے تھے کہ چام نے ہمیں ایک درخت کے پیچھے چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دو شیر اور ایک شیرنی آگے پیچھے چلتے ہوئے جھاڑیوں میں سے گزر رہے ہیں۔ وہ ہم سے تقریباً ڈیڑھ دو سو فٹ دور تھے۔ میں جارج کی طرف مڑا، وہ بے حس و حرکت کھڑا آدم خوروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے دیکھے۔ چام زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے خنجر کمر سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ہمارے دائیں ہاتھ "V" کی شکل کا بارہ فٹ لمبا اور دس فٹ گہرا وہ خونیں گڑھا تھا جس کی تہہ میں تیز اور نوکیلی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔

آدم خور ہماری موجودگی سے بے خبر اس گڑھے کی طرف آ رہے تھے اور جوں جوں وہ نزدیک آتے گئے، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ اب وہ ہم سے صرف تیس فٹ کے فاصلے پر تھے۔ دونوں شیر بڑی جسامت کے اور نہایت طاقت ور تھے۔ شیرنی اگرچہ قد میں چھوٹی تھی لیکن جسمانی قوت میں وہ بھی شیروں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ جارج نے یک لخت رائفل اٹھائی اور نشانہ لینے کے لیے تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور کسی شاخ میں الجھ کر اس طرح گرا کہ رائفل چل گئی۔ دھماکا ہوتے ہی آدم خور گرجے اور انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ مجھ پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ کوشش کے باوجود میں فائر نہ کر سکا۔ چشم زدن میں وہ تینوں چھلانگیں لگاتے ہوئے ہمارے سروں پر آ گئے۔ چام نے چیتے کی مانند جست کی اور اگلے شیر سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے شیر کی گردن پر خنجر سے وار کیا۔ شیر زخمی ہو کر گرجتا ہوا ایک طرف بھاگا اور گڑھے میں گر گیا۔ اس نے چام کو بھی زخمی کر دیا تھا لیکن ہزاروں داؤ پیچ جاننے والا ایک بازو کا یہ نڈر آدمی ذرا نہ گھبرایا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا خون آلود خنجر دوسرے شیر کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ جارج اب سنبھل چکا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے رائفل چھینی اور دور کھڑی ہوئی شیرنی کو نشانہ بنایا۔ دو گولیوں میں شیرنی ڈھیر ہو گئی۔ تیسرا شیر ابھی تک چام سے لپٹا ہوا تھا اور دونوں میں خون ریز جنگ ہو رہی تھی۔ چام کا جسم لہولہان ہو چکا تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ جارج کو رائفل سے نشانہ لیتے دیکھ کر وہ چیخا۔

"صاحب، فائر نہ کرنا، مجھے اس لڑائی میں مزا آ رہا ہے۔"

کاش! جارج اس کی بات نہ مانتا اور شیر کو گولی مار کر ختم کر دیتا، کیوں کہ اگلے ہی ثانیے وہ دونوں لڑھک کر گڑھے میں جا گرے۔ چند لمحوں تک شیر کی چیخوں سے جنگل لرزتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بھائیوں نے گڑھے میں جھانک کر دیکھا، بہادر چام آدم خوروں کی لاشوں میں دبا ہوا تھا اور ایک سلاخ اس کی کمر کو چھیدتی ہوئی پیٹ سے نکل آئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرہ خون میں لت پت تھا لیکن اس نے اپنا خنجر ابھی تک مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ☆☆☆

شیخی خورا

ایک آدمی نے قریب قریب ساری دنیا کا سفر کیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھتا، کوئی نہ کوئی من گھڑت قصہ ضرور سناتا۔

کبھی کہتا۔ "میں نے ایک دن پانچ سو میل پیدل سفر کیا۔ میرے ساتھی پیچھے رہ گئے۔ ساتھیوں کا کیا ذکر، گھوڑے بھی میرا ساتھ نہ دے سکے۔"

کبھی کہتا۔ "جب میں دنیا کا سفر کر رہا تھا تو پچاس آدمیوں کا کھانا اکیلا کھا لیتا تھا۔" غرض اسی طرح مدت تک شیخی بگھارتا رہا۔

ایک روز اس نے بہت سے آدمیوں کے سامنے کہا۔ "جب میں پردیس میں تھا تو ایک روز میں نے اتنی لمبی چھلانگ لگائی کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کیا بتاؤں، سارے آدمی حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے اتنی لمبی چھلانگ مارتے کبھی کسی کو نہ دیکھا تھا۔ اگر اس وقت وہ لوگ یہاں ہوتے تو تم ان سے پوچھ سکتے تھے۔"

سننے والوں میں سے ایک آدمی کو غصہ آ گیا۔ اس نے جل کر کہا۔ "بھائی، ان آدمیوں کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں آپ اس شہر کو پردیس سمجھ لیں، اور اسی طرح ایک چھلانگ لگا کر دکھائیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ سب حال ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

یہ سن کر شیخی خورا بہت شرمایا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے شیخی مارنا چھوڑ دیا۔ ☆☆☆

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

چچا اللہ بخش اکثر بیمار رہتے تھے اور ڈاکٹر کے پاس جاتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر ڈھیر ساری دوائیاں مثلاً شربت اور گولیاں دیتا رہتا۔ چچا اللہ بخش اتنی دوائیاں کھانے سے بہت عاجز تھے۔

آج صبح چچا کو پیٹ میں درد ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے کلینک گئے۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد چچا کو 5 گولیاں دیں اور کہا کہ ہر 30 منٹ کے بعد ایک گولی کھانی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! تو پھر 5 گولیاں کھانے میں کتنا وقت لگے گا؟'' چچا نے پوچھا۔

''چچا اللہ بخش آپ خود بتائیے۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ اب چچا جی کلینک سے باہر نکلے۔ راستے میں ٹونی ملا۔ چچا نے اس سے 5 گولیاں کھانے کا کل وقت پوچھا۔ ٹونی بھی سوچ میں پڑ گیا۔

پیارے بچو! جواب بہت آسان ہے۔ سوچیے مت جلدی سے بتائیے:

جنوری 2018ء کے کھوج لگائیے کا جواب یہ ہے: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

1- امیمہ اسد کیانی، راول پنڈی
2- محمد عیسیٰ جعفر، لاہور
3- لائبہ فاطمہ، لاہور
4- ملیحہ شہباز، وہاڑی
5- محمد ابوبکر عارف قادری، کاموکی

ذاکرہ اشرف، لاہور
میں بڑی ہو کر آرمی کی ڈاکٹر بنوں گی۔

محمد کمیل، لاہور
تعلیم حاصل کرنا اور ایک اچھا انسان بننا۔

محمد طفیل الرحمان
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

احمد حسن، بہاولپور
میں ایئرفورس میں جاؤں گا اور ملک کی فضائی سرحدوں کی حفاظت کروں۔

عائزہ امجد، لاہور
میں بڑی ہو کر بچوں کا مستقبل روشن کروں گی۔

سفا تصور، میرپور آزاد کشمیر
میں بڑی ہو کر سافٹ ویئر انجینئر بنوں گی اور ملک کا نام روشن کروں گی۔

محمد طارق شاہد، لاہور
میں آرمی آفیسر بننا چاہتا ہوں۔

احمد حسین، لاہور
میں بڑا ہو کر ٹیک انجینئر بنوں گا اور اپنے ملک کی ترقی کا حصہ بنوں۔

روزینہ ظفر، لاہور
میں آرمی کی ڈاکٹر بنوں گی اور پاک فوج کی خدمت کروں گی۔

اقرا ہدایت، لاہور
میں بڑی ہو کر پاک فوج میں جانا چاہتی ہوں اور ملک کا نام روشن کرنا چاہتی ہوں۔

وانیہ اشرف، لاہور
میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی پھر میں [illegible] ڈاکٹر بنوں گی۔

عبدالرحمن منصور، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں بڑا ہو کر چیف آف آرمی اسٹاف بنوں گا اور ملک سے دہشت گردی کا ستیاناس کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

محمد کمیل آزاد، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔

رضوان رزاق، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد علی، قصور
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔

رفعت جہاں، اوکاڑہ
میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کی مدد کروں۔

آمنہ رفیق، لاہور
میں ٹیچر بن کر بچوں کا مستقبل روشن کرنا چاہتی ہوں۔

شمیر اقبال کھوسہ، راولپنڈی
میں سی ایس ایس کر کے بڑا افسر بنوں گا۔

عائشہ عظیم، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور لوگوں کی خدمت کروں گی۔

نور فاطمہ اشفاق، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔

حفصہ علی، لاہور
میں سائنسی انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گی۔

قاری عطاء الرحمن سجاد، ہیکوٹی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گا۔

محرب ظفر، لاہور
میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور طالبات کو زیور تعلیم سے آراستہ کروں گی۔

محمد الیاس بھٹی، لاہور
میں ڈاکٹر بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

سید حسن شاہد، لاہور
میں بڑا ہو کر پولیس آفیسر بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

کتاب دوست بنیں

کتابوں سے جو بھی محبت کرے گا
وہ آگے بڑھے گا ترقی کرے گا
کتابیں ہیں حکمت کا موتی سنو تم
جو ان کو پڑھے گا صدا خوش رہے گا
یہ وہ پھول ہیں جو کہ مہکیں ہمیشہ
جو ان کا ہو شیدا وہ مہکا کرے گا
کتابوں کی رسیا ہوئیں جو بھی قومیں
ترقی کا پہیہ وہیں پر چلے گا
کتابوں کو جو بھی ہاں زیور بنا لے
خلق اس کا سونے سے مہنگا تلے گا
عظیم جس نے کی ہے کتابوں سے چاہت
صلہ اس کو اس کا ہمیشہ ملے گا

(عظیم الرحمن صدیقی، لاہور)

حکمت کی باتیں

☆ جتنا علم جانتے ہو اتنا عمل بھی کرو کیوں کہ علم، عمل کو آواز دیتا ہے اور اگر کوئی جواب نہ آئے تو علم رخصت ہو جاتا ہے۔

☆ شرک کے بعد بڑا گناہ والدین کی نافرمانی ہے۔

(سلمیٰ لیاقت علی، میرپور آزاد کشمیر)

☆ تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرو۔

☆ اگر ہارا ہوا انسان ہارنے کے بعد بھی مسکرا دے تو جیتنے والا اپنی جیت کی خوشی کھو دیتا ہے۔ (عائشہ لیاقت، میرپور آزاد کشمیر)

عرض ہے

یہی ہے عبادت یہی ہے دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

(معظم، عمر، چونیاں)

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

(حافظہ لائبہ بنت الیاس، فیصل آباد)

فقط ان کو ملتی ہے عزت زیادہ
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

(فرید گھلو، اٹھارہ ہزاری)

آرزو

اکبر کے دربار کے امیر بیرم خان خاناں سیرت کے ساتھ ساتھ صورتاً بھی نہایت حسین تھے۔ ان کی خوبیاں اور محبوبیاں سن کر ایک عورت کو اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ خود بھی حسین تھی۔ اس نے اپنی تصویر بنوائی اور ایک بڑھیا کے ہاتھ بھیجی۔ وہ خلوت میں آ کر خان خاناں سے ملی اور مطلب کو اس پیرائے میں ادا کیا کہ ایک بیگم کی یہ تصویر ہے۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ کی تعریفیں سن سن کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔ ارمان یہ ہے کہ آپ جیسا ایک فرزند میرے ہاں ہو۔ آپ بادشاہ کی آنکھیں ہیں، زبان ہیں، دست و بازو ہیں۔ یہ بات کچھ مشکل نہیں۔ خان خاناں نے سوچ کر کہا۔ ''مائی! میری طرف سے انہیں کہنا کہ یہ بات کچھ مشکل نہیں، مگر کیا معلوم اولاد ہو یا نہ ہو اور ہو تو کیا خبر ہے، بیٹا ہی ہو اور زندہ بھی رہے۔ پھر خدا جانے ایسی صورت ہو یا نہ ہو۔ یہ بھی موت و مستقبل پر کس کا زور ہے خدا چاہے دے، خدا چاہے نہ دے۔ اگر انہیں مجھ جیسے بیٹے کی آرزو ہے تو کہنا، تم ماں، میں بیٹا۔ خدا کا شکر کرو، جس نے پلا پلایا بیٹا تمہیں عطا کیا۔''

بڑے لوگ بڑی باتیں

☆ تقویٰ سینے میں ہے تو مزا جینے میں ہے۔

☆ مصائب سے مت گھبراؤ کیوں کہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

☆ پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہے۔

☆ برائی کرنے والے سے نہیں بلکہ برائی سے نفرت کرو۔

(قاری عطاء الرحمٰن معاویہ)

اقوال زریں

☆ سب لوگوں سے محبت کرو۔ بہت کم لوگوں پر بھروسہ کرو لیکن کسی کی برائی مت کرو۔ (شیکسپیئر)

☆ اس بڑی دنیا میں بھلائی دور تک چمک سکتی ہے۔ (شیکسپیئر)

☆ بے انصافی کو مٹاؤ لیکن اپنے آپ کو مٹا کر نہیں۔ (رسکن)

☆ جو آخرت کو دنیا سے بہتر جانے وہ ایمان والا ہے۔
(حضرت امام غزالیؒ)

☆ اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے۔ (ہربرٹ اسپنر)

(مرسلہ: ثروت یعقوب، لاہور)

کارمورینٹ "مچھلیوں کا شکاری"

مچھلیوں کا شکاری "کارمورینٹ" چمکیلی سیاہ لمبی جیسا آبی پرندہ ہے اسے "چینکوا" بھی کہتے ہیں۔ یہ تالابوں اور جھیلوں کے نزدیک دکھائی پڑتے ہیں۔ یہ ماہر غوطہ خور اور تیراک ہوتے ہیں اور صرف مچھلیوں پر ہی زندہ رہتے ہیں۔ پانی کے اندر اس طرح تیرتے ہیں جیسے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ تیرنے اور مچھلیاں کھانے کے بعد کسی چٹان پر بیٹھ کر اپنے پر پھیلا کر خود کو سکھاتے ہیں۔

"کارمورینٹ" کی گردن لمبی اور سرے پر سے تھوڑی مڑی ہوتی ہے۔ سر کے اوپر چھوٹی سی کلغی اور کنٹھ پر سفید دھبہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں نر اور مادہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ مادہ چار یا پانچ انڈے دیتی ہے۔ ان کا اپنا گھونسلہ بنانے کا وقت شمالی بھارت میں جولائی سے ستمبر اور جنوبی بھارت میں نومبر سے فروری تک ہوتا ہے۔ یہ اپنا گھونسلہ درختوں پر دیگر پرندوں کی ملی جلی بستی میں بناتے ہیں۔

چین اور جاپان میں سینکڑوں برسوں سے "کارمورینٹ" کے ذریعے مچھلیوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ آج کل کے جدید طریقوں کے مقابلے میں یہ طریقہ مہنگا اور مشکل ہے مگر اس میں سیاحوں کی دل چسپی کا راز ہے۔ مچھلیوں کے شکار کے لیے کارمورینٹ کی گردن میں چمڑے کا نرم پٹہ اور لمبی ڈور باندھ کر اسے تربیت دی جاتی ہے۔ یہ پرندہ مالک کے اشارے پر ڈبکی لگاتا ہے اور مچھلی پکڑ کر باہر آجاتا ہے۔ اس طرح تمام رات شکار کیا جاتا ہے اور شکار کے بعد اس کی گردن آزاد کر دی جاتی ہے اور پکڑی گئی مچھلیوں کی کھیپ میں سے اسے بھی حصہ دیا جاتا ہے جیسے وہ اس کی محنت کی مزدوری ہو۔
(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

لفظوں کا دل چسپ سفر

☆ مؤنث: عربی زبان میں مال، روپیہ، پیسہ، خرچہ، روز کے استعمال کی اشیاء کھانے پینے کی اشیاء کے لیے لفظ "مؤنث" استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ ان اشیاء کے حصول میں نقدی اور رقم کا بنیادی کردار ہوتا ہے اس لیے انگریزی میں "مؤنث" نے "منی" MONEY کی شکل اختیار کر لی۔ مراد وہی ہے، نقدی، سکہ رائج زر، مال و دولت وغیرہ۔

☆

☆ مشک: فارسی زبان کا مشہور لفظ ہے۔ مراد ہے، وہ خوش بو دار سیاہ رنگ کا مادہ جو ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے۔ سیاہ رنگ کو بھی مشک کہہ دیتے ہیں اور مشک کے رنگ کے گھوڑے کو "مشکی گھوڑا" کہا جاتا ہے۔ "مشک" کو خوش بو کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے اور نہایت معطر، خوش بو دار کو "مشکبار" کہہ دیتے ہیں۔ فارسی کا یہی "مشک" عربی میں پہنچ کر "مسک" بن گیا اور انگریزی میں جانے کے بعد اس نے "مسک" MUSK کی شکل اختیار کر لی۔ مراد وہی ہے خاص قسم کے ہرن کی ناف سے نکلنے والا خوش بو دار مادہ۔
(کنیز زہرہ، لاہور)

ڈاکٹر

ایک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یوں
کرتا ہے میرے کام کو دشوار کس لیے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بنا ہوا ہے تو بیمار کس لیے
(محمد حسن، کراچی)

معلومات عامہ

☆ دنیا کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ 1953ء میں فتح ہوئی۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ "گرین لینڈ" ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ کھجوریں عراق میں پیدا ہوتی ہیں۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا پارک نیشنل پارک امریکہ میں ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ لکھی اور پڑھی جانے والی زبان انگریزی ہے۔

☆ دنیا کا قدیم پرچم ڈنمارک کا ہے۔ (قاضی ایوب خان، اٹک)

☆☆☆

روتا دل

روتا دل یا Bleeding Heart درحقیقت ایک پودا ہے۔ جس کا سائنسی نام "Lamprocapnos Spectabilis" ہے۔ اس کا تعلق "Papaveraleae" خاندان سے ہے۔ اسے عربی

میں "زہرۃ القلب النازف" اور فارسی میں "قلب خونیں" کہا جاتا ہے۔ یہ پھول دار پودا چین، کوریا، سائبریا، جاپان، تھائی لینڈ وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پھول دل کی مانند سرخ ہوتے ہیں جن کے نیچے لٹکتی سفید پتیاں یوں معلوم ہوتی ہیں کہ دل رو رہا ہو یا اس میں سے آنسو ٹپک رہے ہوں۔ یہ پودا 45 سے 47 انچ (120 سینٹی میٹر) بلند اور 18 انچ (45 سینٹی میٹر) تک چوڑائی ہوتی ہے۔ یہ سدا بہار پودا لکڑی کے بغیر تنے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے تنے کا ایک حصہ زیرزمین ہوتا ہے۔ اس تنے کو رائی زوم (Rhizome) کہتے ہیں۔ تنے پر تین پیچیدہ سے (Lobed) پتے ہوتے ہیں۔ پھول ایک ڈنڈی پر نکلتے ہیں جس پر 15 سے 20 پھول دل کی شکل میں لٹک رہے ہوتے ہیں۔ بیرونی پتیاں گلابی اور اندرونی پتیاں سفید ہوتی ہیں۔ انسانی جسم پر پودا چھو جائے تو خارش پیدا ہوتی ہے۔ یہ پھول 1842ء میں اسکاٹ لینڈ کے سائنس دان Robert Fortune نے دریافت کیا۔

سنبلی میکاؤ

سنبلی میکاؤ ایک نیلے پروں والا طوطا (توتا) ہے جو قدرتی طور پر مرکزی اور مشرقی جنوبی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ میکاؤ طوطے کا سائنسی نام "Anodorhynchus Hyacinthinus" ہے۔ اس کا تعلق کلاس اے ویز (Aves) سے ہے۔ یہ طوطا 100 سینٹی میٹر لمبا (3.5 فٹ) اور 2 سے 3.5 کلوگرام وزنی ہوسکتا ہے۔ طوطے کی نسل میں یہ سب سے بڑا طوطا ہے۔ اسے انگریزی میں "Hyacinth Macaw"، عربی میں "مکاؤ یاقوتی" جب کہ فارسی میں "مکاؤ سنبلی" کہا جاتا ہے۔ یہ خوب صورت پرندہ سب سے پہلے 1790ء میں برطانیہ کے ماہر "John Lathm" نے بیان کیا۔ اس کی دم لمبی و نوکیلی ہے جس پر نیلے رنگ کے پَر (Feathers) ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ اخروٹ، بادام، پستہ، چلغوزے اور پودوں کے بیج کھاتا ہے۔ ان کی مضبوط و طاقت ور چونچ ناریل میں بھی سوراخ کر دیتی ہے۔ یہ درختوں پر گھونسلہ بنا کر انڈے اور بچے پیدا کرتا ہے۔ انڈے سے بچے ایک ماہ تک نکل آتے ہیں۔ دیگر پرندوں کی طرح اس پرندے کی بقاء کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ تاہم کچھ ممالک مثلاً برازیل،

بولیویا وغیرہ نے اسے محفوظ رکھنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ "Toco Toucan" نامی پرندہ بھی اس طوطے کے لیے خطرناک ہے کیوں کہ یہ پرندہ اس کے انڈے کھا جاتا ہے۔

بائل ڈکٹ کینسر

دُنیا بھر میں ہر سال 15 فروری کو بائل ڈکٹ کینسر ڈے (Bile Duct Cancer Day) منایا جاتا ہے۔ انسانی جگر سے ایک نالی نکلتی ہے جس کے ذریعے ایک رطوبت بائل جگر سے چھوٹی آنت میں لے جاتی ہے۔ یہ رطوبت (Secretion) ہماری کھائی ہوئی چکنائیوں کو ہضم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر اس نالی میں سرطان (Cancer) پیدا ہو جائے تو اسے سائنسی اصطلاح میں "Cholangiocar Cinomas" کہتے

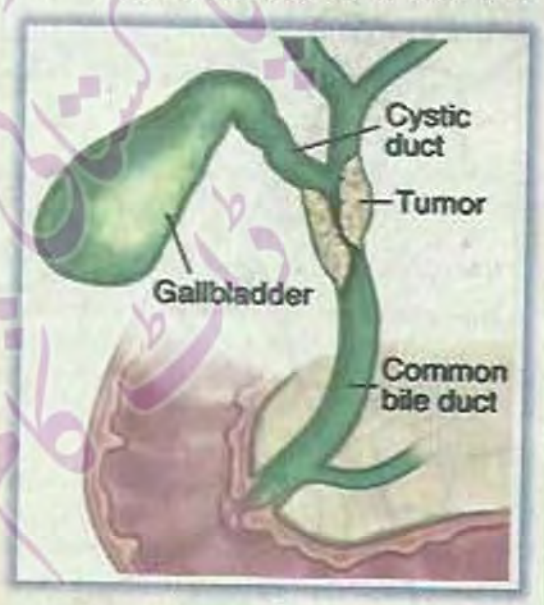

ہیں۔ شروع میں اس کا علاج ممکن ہے۔ اس سرطان کی علامات میں یرقان (Jaundice)، وزن میں کمی، بھوک میں کمی، بخار اور پیٹ میں درد رہتا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے بائل ڈکٹ میں سوزش پیدا ہو جاتی ہے۔ شراب، سگریٹ اور تمباکو وغیرہ کے استعمال سے اس بیماری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اس بیماری کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے یہ دن منایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس بیماری کے بارے میں لوگوں کے پاس کم معلومات دستیاب ہیں۔ چناں چہ سرجری اور علاج بارے لوگوں کو سیمینارز، کانفرنسوں اور ورکشاپس میں اس مرض سے آگاہی دی جاتی ہے۔ دیگر سرطان کی اقسام کے مقابلے میں یہ کینسر نسبتاً کم لوگوں میں ہوتا ہے۔

یاقوت

یاقوت ایک قیمتی پتھر ہے۔ جسے انگلش میں "Ruby" عربی میں "یاقوت" اور فارسی میں "یاقوت سرخ" کہا جاتا ہے۔ یہ معدنی آکسائیڈ ہے جو کرسٹلز (Crystals) کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ جسے تراش کر ہیرے کی شکل دی جاتی ہے۔ سائنسی اعتبار سے یاقوت ایلومینیم آکسائیڈ ہے۔ اس میں کرومیم (Chromium) کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کا کیمیائی فارمولہ $Al_2O_3:Cr$ ہے۔ انگریزی میں لفظ "Ruby" درحقیقت لاطینی زبان کے لفظ

"Ruber" سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے "سرخ"۔ اس پتھر میں سرخی مائل رنگت کی وجہ کیمیائی عنصر کرومیم ہے۔ اس کی قیمت کا انحصار اس کی سرخی، چمک اور صفائی پر ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ قیمتی پتھر برما (اب جسے میانمر کہتے ہیں)، تھائی لینڈ، کمبوڈیا افغانستان، برازیل، آسٹریلیا، نمیبیا، بھارت، جاپان، اسکاٹ لینڈ نیپال، پاکستان، ویت نام، تنزانیہ، تاجکستان، مڈغاسکر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اس پتھر کو تراش کر قیمتی زیورات و جواہرات کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سرخ رنگت کے علاوہ نارنجی، گلابی، جامنی رنگت والے Ruby پتھر بھی چٹانوں میں پائے جاتے ہیں۔

☆☆☆

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

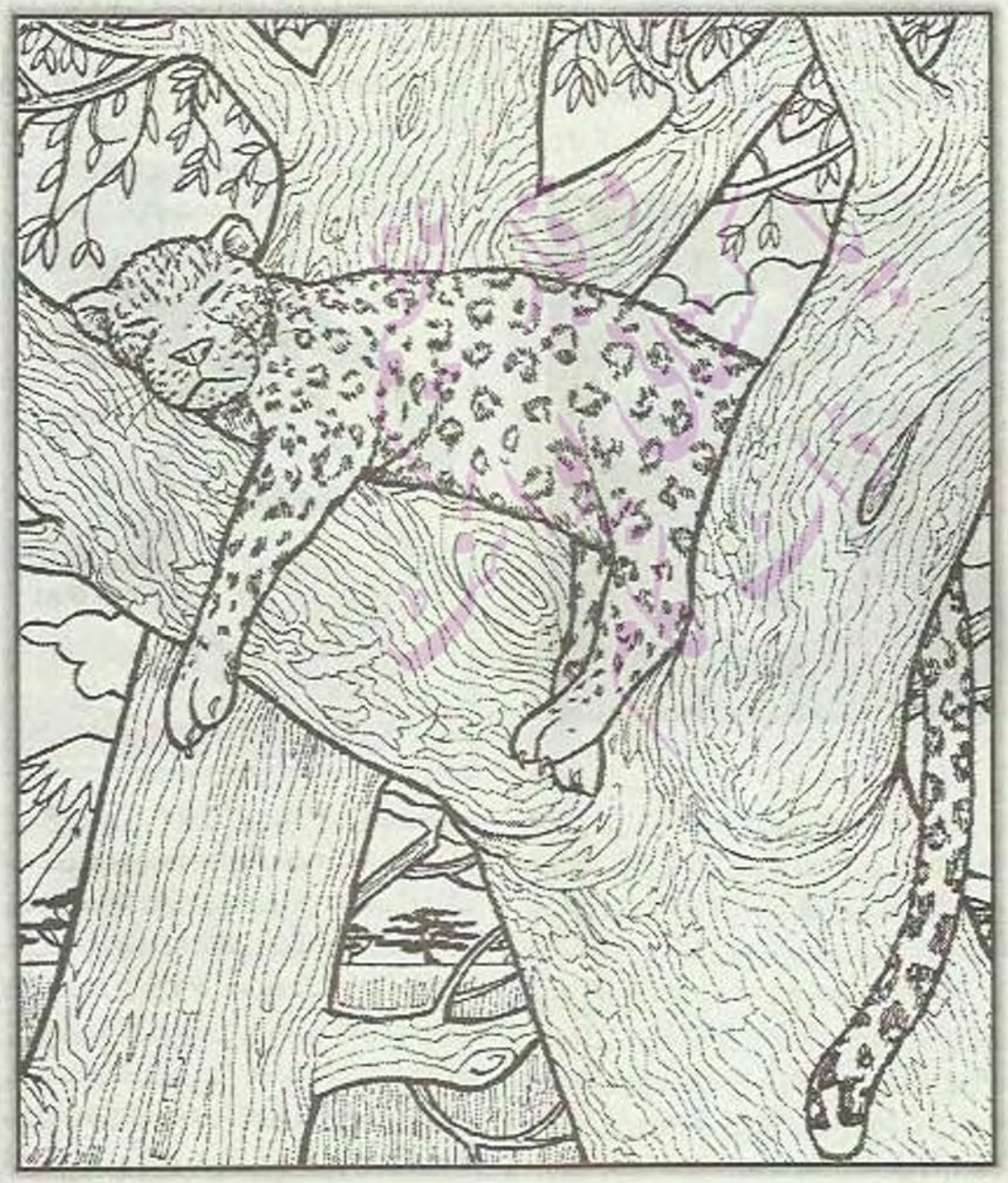

کام یابی کے اصول (3)
ایک روشن خواب دیکھیے

ایک ریسرچ کے دوران پتا چلا کہ وہ تمام لوگ جنہوں نے اپنی زندگی میں زبردست کام یابی حاصل کی:

☆ روزانہ اوسطاً چودہ گھنٹے کام کرتے ہیں۔
☆ گذشتہ بیس سے تیس سالوں سے وہ مسلسل اسی طرح کام کر رہے ہیں۔
☆ عام دنوں میں، حتیٰ کہ بیمار بھی ہوں تو بھی کام سے چھٹی کا تصور تک نہیں کرتے۔
☆ صبح سویرے اٹھتے اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔
☆ دفاتر میں جلدی جاتے اور دیر تک رکتے ہیں۔
☆ راتوں کو دیر تک کام کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔
☆ کام کی زیادتی کی کبھی شکایت نہیں کرتے۔
☆ اتنی جلدی بیمار بھی نہیں پڑتے۔
☆ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کام جاری رکھتے ہیں۔
☆ کام کرنے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔
☆ اپنے کام سے اتنا پیار کرتے ہیں، خواہ اس سے انہیں کچھ بھی نہ ملے پھر بھی وہ اسے کرنے کو تیار ہوں۔

''کام ایک ایسا عمل جو بہت مشکل اور محنت طلب ہے، جس کو کرنے میں آپ خوشی کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔'' کام یاب لوگ صرف ''کام'' ہی نہیں کرتے بلکہ وہ ایسا کام کرتے ہیں جسے میں ''زندگی کا کام'' یعنی life-work کہتا ہوں۔ وہ لوگ اپنے کام سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ انہیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ہماری زندگی کا اصل بیج دراصل ہماری زندگی کا مقصد اور جذبہ ہے۔ ''مستقبل ان کا ہوتا ہے جو اپنے خوابوں کی خوب صورتی پر یقین رکھتے ہیں۔'' (ایلینر روز ویلٹ) پس زندگی میں کام یابی کے لیے روشن خواب دیکھیے۔

ہر عمل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/فروری 2018ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: _____
شہر: _____
مکمل پتا: _____
_____
موبائل نمبر: _____

ہر عمل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/فروری 2018ء ہے۔

دماغ لڑائیے

نام: _____
مقام: _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

فروری کا موضوع "باغ اور مالی" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 8/فروری 2018ء ہے۔

ہونہار مصور

نام _____ عمر _____
مکمل پتا: _____
_____
موبائل نمبر: _____

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام _____ شہر _____
مقاصد _____
_____
موبائل نمبر: _____

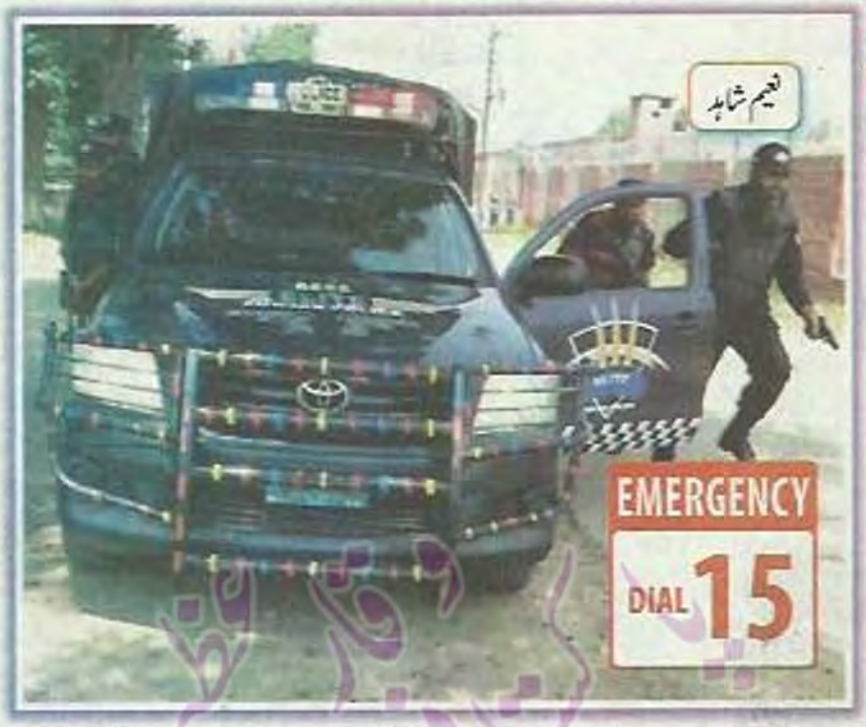

نعیم شاہد

پیارے بچو! آپ سب یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ بھلا میں کون ہوں؟ بھئی میں 15 نمبر ہوں، ویسے زیادہ تر لوگ مجھے ون فائیو (one five) کہتے ہیں۔ آپ مجھے کوئی عام سا نمبر مت سمجھیے، میں بڑا ہی خاص نمبر ہوں، کیا کہا، وہ کیسے.....؟

وہ ایسے کہ میں ایمرجنسی نمبر ہوں۔ یہ کیا.....؟ آپ کے چہروں پر ابھی بھی حیرانگی نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے مجھے ذرا تفصیل سے آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہیے۔

پیارے ساتھیو! آپ نے سڑکوں، چوراہوں اور اکثر مقامات پر پولیس کی جانب سے لگائے ہوئے بورڈ تو ضرور دیکھے ہوں گے جن پر بڑا سا مجھے یعنی 15 نمبر کو لکھا ہوتا ہے۔ یہ ایمرجنسی نمبر ہوتا ہے اور پورے ملک میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ بھی اس نمبر کو یعنی مجھے یاد رکھیے کیوں کہ میں بہت کام کا نمبر ہوں۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ سب لوگ مجھ سے کس طرح کام لے سکتے ہیں؟

دیکھیے، آپ اسکول جا رہے ہوں یا اسکول سے واپس آ رہے ہوں، ہمیشہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں۔ اس دوران اگر خدانخواستہ آپ کے سامنے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو فوراً قریبی پی سی او (PCO) یعنی پبلک کال آفس سے 15 نمبر یعنی ون فائیو ملایے۔ وہاں سے کوئی صاحب یا صاحبہ آپ سے پوچھیں گی کہ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ تو آپ انہیں بتایے کہ فلاں جگہ پر حادثہ یا واقعہ پیش آ گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس وہاں پہنچ جائے گی کیوں کہ میں پولیس ہیڈ کوارٹر کا ایمرجنسی نمبر ہوں۔ اس کے علاوہ اگر رات کے وقت یا کسی اور وقت آپ کے گھر میں کوئی چور گھس آیا ہو تو ایسی صورت میں بھی خاموشی سے، چھپ کر ٹیلی فون سے 15 نمبر ملایے اور اپنے گھر کا پتا بتا کر انہیں مختصراً بتایے کہ آپ کو ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس آپ کی مدد کے لیے موجود ہو گی۔ اس کے علاوہ اگر خدانخواستہ آپ کے یا کسی اور کے گھر میں آگ لگ جائے تو فوراً مجھے ساری صورت حال بتایے۔ عملے کے لوگ فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دیں گے اور آناً فاناً آگ بجھانے والا عملہ آپ کی مدد کو آ پہنچے گا۔

سب سے اہم بات میرے ساتھیو یہ ہے کہ آج کل کچھ برے لوگ جنہیں دہشت گرد کہتے ہیں، مختلف بازاروں، بس اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن اور دوسرے ایسے مقامات پر جہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ ہوتی ہے، وہاں بریف کیس، شاپنگ بیگ، کپڑے کی گٹھڑی، چائے اور پانی والے تھرماس اور بچوں کے مختلف کھلونوں میں بم رکھ دیتے ہیں۔ جوں ہی کوئی ایسی چیزوں کو ہلاتا یا اٹھاتا ہے تو بم پھٹ جاتا ہے۔ یوں بے شمار بے گناہ اور معصوم لوگ مر جاتے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ایسے مقامات پر جب بھی جائیں تو اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں۔ اگر آپ کو کوئی مشکوک چیز یا مشکوک آدمی یا عورت نظر آئے تو فوراً ون فائیو پر یعنی مجھے اطلاع دیں اور کسی بھی لاوارث یعنی یوں ہی پڑی ہوئی کسی بھی چیز یا کھلونے کو مت اٹھائیں۔ ہو سکتا ہے دہشت گردوں نے اس میں بم رکھا ہو۔ دیکھا آپ نے کہ میں کتنے کام کا نمبر ہوں۔ اس لیے ہمیشہ مجھے یاد رکھیے اور ہر طرح اور ہر قسم کی ایمرجنسی میں ٹیلی فون پر مجھ سے رابطہ کیجیے اور مدد حاصل کیجیے۔ ☆☆☆

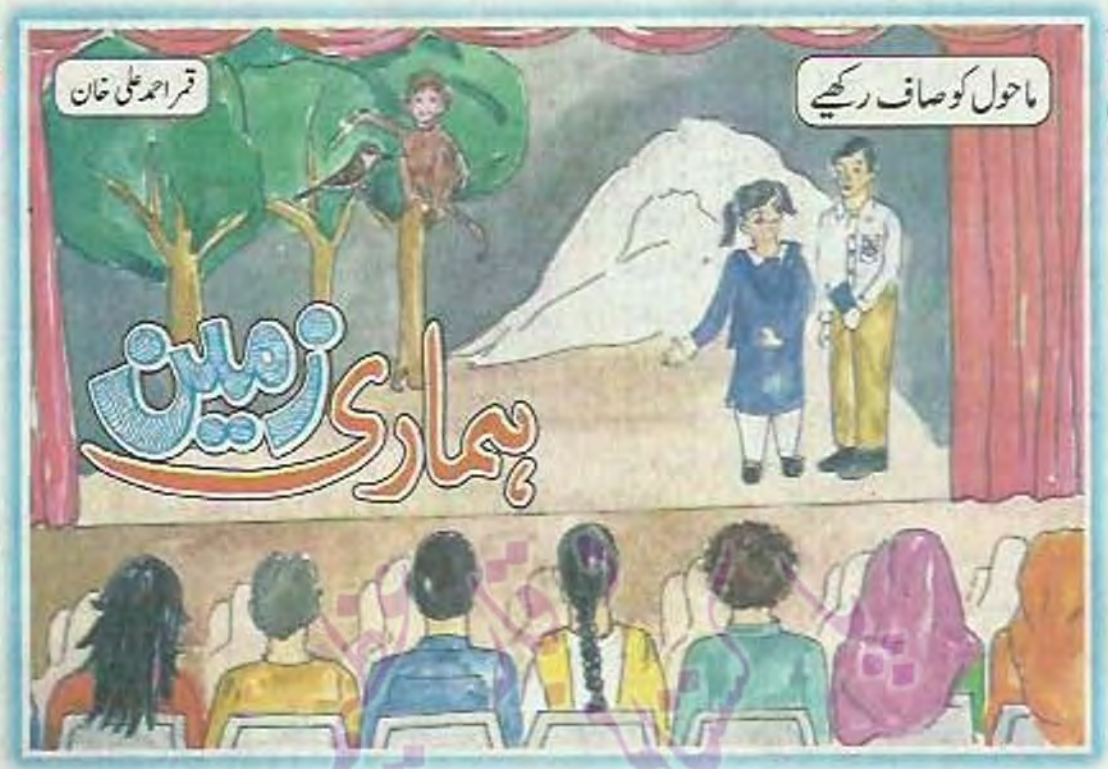

کردار: انور (بھیا) بانو (بہن) تین چار پیڑ، بندر، چڑیا۔
ایک ٹیلا اور چند پھولوں کے گملے
نریٹر

سین 1

(پردہ کھلتا ہے)

(نریٹر داخل ہوتا ہے)

نریٹر: حاضرین۔ السلام علیکم..... جماعت کے بچے ماحولیات کا دن منانے کے لیے آپ کے سامنے ایک ڈرامہ 'ہماری زمین' پیش کر رہے ہیں۔ (نریٹر چلا جاتا ہے)

(انور اور بانو کچھ باتیں کرتے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں۔)

بانو: بھیا! آج امی کی سال گرہ ہے۔ میں نے کوئی تحفہ نہیں خریدا۔ میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ آپ کچھ پیسے دے دیجیے۔ اگلے مہینے جیب خرچ ملے گا تو واپس کر دوں گی۔

انور: بانو سچ بات تو یہ ہے کہ میرے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔ اسکول میں پارٹی ہونے والی ہے مجھے اس کے لیے پیسے دینا پڑے۔

انور: بانو سچ بات تو یہ ہے کہ میرے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔ اسکول میں پارٹی ہونے والی ہے مجھے اس کے لیے پیسے دینا پڑے۔

بانو: پھر کیا کریں بھیا؟ مجھے تو بہت برا لگے گا۔ اگر میں امی کو کوئی بھی تحفہ نہ دے سکی۔ امی ہمارے لیے کتنا کچھ کرتی ہیں۔

انور: اچھا سوچتے ہیں۔ (ٹہلتا ہے اور سوچتا ہے۔ پھر ایک دم سے بانو کی طرف مڑ کر) بن گئی بات!

بانو: کیا؟ کیا؟ جلدی بتایئے۔

انور: ہمارے گھر کے پاس جو جنگل سا ہے اس میں میں نے بہت اچھے اچھے پھول دیکھے ہیں۔ وہاں چلتے ہیں۔ پھولوں کا ہار بنا کر امی کو دیں گے۔ ان کو ویسے بھی پھول بہت پسند ہیں۔

بانو: بالکل ٹھیک! اچھا خیال ہے! اب جلدی چلیے۔

(دونوں جاتے ہیں۔) (پردہ بند ہوتا ہے)

سین 2

(ایک ویران سی ریتلی جگہ ہے۔ جس میں تین چار پیڑ ایک طرف لگے ہوئے ہیں۔ ذرا ہٹ کر ایک طرف کو ٹیلا ہے جس کے پیچھے سے کچھ پھول نظر آ رہے ہیں۔ انور اور بانو داخل ہوتے ہیں۔)

انور: ارے یہی جگہ تو ہے۔ پہلے یہ کیسی سرسبز تھی۔ اب تو ریت ہی ریت ہے۔

صرف دو چار پیڑ رہ گئے ہیں۔

پیڑ (1): کچھ دن کے بعد آتے تو یہ بھی دکھائی نہ دیتے۔

(بانو ڈر کر بھائی سے لپٹ جاتی ہے۔)

بانو: بھیا کیا پیڑ بھی بولتے ہیں؟

انور: چپ رہو (انگلی منہ پر رکھتا ہے) سننے دو۔

پیڑ(2): انسان بلاسوچے سمجھے پیڑ کاٹتا چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ ہم اسی کے فائدے کے لیے ہیں۔

پیڑ(3): بچے ہمارے نیچے کھیلتے ہیں۔ بڑے تھک کر ہمارے سائے میں آرام کرتے ہیں۔ ہم ان کو تازہ ہوا دیتے ہیں۔

پیڑ(1): زمین کو ریت بننے سے روکتے ہیں۔

پیڑ(2): چڑیاں ہم میں گھونسلا بناتی ہیں۔ انڈے دیتی ہیں۔ (چڑیا پر پھڑ پھڑاتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ پیڑوں کے بیچ میں سے نکل کر آتی ہے)

چڑیا: ہاں یہ سچ ہے جس پیڑ میں میرا گھونسلا تھا وہ کاٹ دیا گیا۔ میرے انڈے گر کر ٹوٹ گئے۔ میں بے گھر ہوگئی۔ (پیڑ کے پیچھے چلی جاتی ہے۔)

پیڑ(3): کچھ جانور بھی ہم پر بسیرا کرتے ہیں۔ ہم ان کے لیے گھر کی مانند ہیں۔

بندر: (پیڑوں کے بیچ میں سے کودتا اچھلتا لگتا ہے۔) میں پیڑوں کی شاخوں پر جھولا جھولتا پھرتا ہوں اور دل چاہا تو سو جاتا ہوں۔ پیڑوں سے پھل توڑ کر کھاتا ہوں۔ پیڑ مجھے سایہ دیتے ہیں۔ ورنہ چلچلاتی ریت۔ اس پر چلنے سے تو پیر جلتے ہیں۔

بانو: تم سب کی باتیں سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ بھیا ہم کیوں پیڑ کاٹتے ہیں؟

انور: انسان مجبور ہے۔ اس کو کبھی پیٹ بھرنے کے لیے لکڑی کاٹ کر بیچنا پڑتی ہے تو کبھی گھر اور فرنیچر بنانا ہوتا ہے۔

پیڑ(1): اگر ایسا ہے تو اس کو اتنی عقل تو ہونی چاہیے کہ ایک پیڑ کاٹے تو دوسرا لگا دے۔ تاکہ یہ زمین ریتلی ہونے سے بچ جائے۔ اور اس کی خوب صورتی قائم رہے۔

بانو: پیڑ بھائی ٹھیک کہتے ہو۔ اب ہم نہ پیڑ کاٹیں گے اور نہ پھول توڑیں گے۔ ہم پھول توڑنے آئے تھے کہ ہار بنا کر امی کو ان کی سال گرہ پر دیں گے۔

پیڑ(1): نہیں جاؤ۔ اس ٹیلے کے پیچھے کچھ پھول لگے ہیں توڑ لو۔ (انور اور بانو ٹیلے کی طرف جاتے ہیں۔ بانو خوش ہو کر پھولوں کی طرف بڑھتی ہے۔ آواز آتی ہے)

آواز: آؤ۔ آؤ۔ آؤ (بانو ڈر کر پیچھے ہٹتی ہے۔ انور ہاتھ بڑھا کر پھول توڑنا چاہتا ہے۔ آواز آتی ہے)

آواز: اوچ، اووچ (انور ڈر جاتا ہے۔ ہاتھ روک لیتا ہے)

بانو: بھیا یہاں تو پھول بھی بولتے ہیں۔ چلیے واپس۔ ہم نہیں توڑتے۔

پھول (1): ڈر گئیں! ہم تو پھول ہیں نازک ہونے کے باوجود سب کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ پہلے اپنی زمین کو خوب صورت بناتے ہیں۔ خوش بو سے لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ پھر گھر کی زینت اور لوگوں کی گردنوں کا ہار بنتے ہیں۔ کوئی تقریب یا خوشی ہو ہمارے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

پھول (2): مکھیاں ہمارا رس چوس کر شہد بناتی ہیں جو انسانوں کے ہزاروں کام آتا ہے۔

پھول (3): پیاری پیاری تتلیاں ہمارے گرد اڑتی پھرتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں۔ ہم کو توڑ لو لیکن ذرا احتیاط سے۔ اپنی خواہش پوری کرو۔ ورنہ ہم تو کل تک مرجھا ہی جائیں گے۔

بانو: شکریہ پیارے پھول۔ آپ میری امی کے گلے کا ہار بنیں گے۔ وہ کتنی خوش ہوں گی۔

پھول (2): ہم آخر وقت تک خوشی پہنچاتے ہیں۔ یہی ہمارا کام ہے۔ مگر بے وقوف انسان یہ نہیں سمجھتا۔ وہ جب چاہتا ہے ہاتھ سے مسل کر ہم کو پھینک دیتا ہے یا کوڑے کے ڈبے میں ڈال دیتا ہے۔ (پردہ بند ہوتا ہے)

(سین 2 میں ایک طرف ذرا زاویے پر پیڑ ہوں۔ کچھ فاصلے پر ٹیلا ہو جو چند کرسیوں کو اوپر نیچے رکھ کر بنایا جا سکتا ہے اس پر بھورا یا گہرا سرمئی کپڑا ڈال دیا جائے۔ اگر اس پر کچھ گھاس وغیرہ پینٹ کی جا سکے تو اور اچھا لگے گا) ٹیلے کے پیچھے اونچی میز پر کچھ گملے رکھے جا سکتے ہیں جن میں پھول لگے ہوں۔ کچھ بچے انہی گملوں کے پاس کھڑے ہوں اور پھول کے بجائے گفتگو کریں۔ (ٹیلے کے پیچھے سے گملے اور بچے سامنے سے نظر نہیں آنا چاہئیں صرف پھول پتے نظر آئیں) پیڑوں کے لیے بچوں کو بھوری شلوار یا پتلون پہنایا جائے اور ہری ٹی شرٹ۔ وہ یا تو پیڑ کی بڑی سی شاخ لے کر کھڑے ہوں یا کارڈ بورڈ پر پینٹ کیا ہوا درخت۔ بندر کا لباس overall بھورا ہو۔ بھوری ٹوپی میں کان ہوں۔ چڑیا کو جو لباس مناسب سمجھا جائے پہنایا جا سکتا ہے لیکن پر ضرور ہونے چاہئیں۔ بندر اور چڑیا دونوں کو چلنے اور بات کرنے کی مشق دینی پڑے گی۔ (بندر کودتا ہوا آئے گا۔ چڑیا اڑتی ہوئی آئے گی۔)

☆☆☆

ایک خاتون بس کنڈکٹر سے پوچھنے لگیں۔ ''کیا بچوں کا آدھا ٹکٹ لگتا ہے؟''

کنڈیکٹر نے کہا۔ ''جی ہاں، لیکن وہ بارہ سال سے کم ہونے چاہئیں۔''

خاتون بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ میرے تو ابھی چھ ہی ہیں۔''

(جاسر رضی صدیقی، اسلام آباد)

ایک صاحب ایک ہوٹل میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک بار کہیں باہر چلے گئے۔ کئی دن بعد آئے تو اسی ہوٹل میں گئے اور کھانا کھاتے ہوئے بیرے کو بلا کر پوچھا۔ ''بھئی ہوٹل کا باورچی بدل گیا ہے کیا؟ معلوم ہوتا ہے کوئی بوڑھا ہے۔''

بیرے نے کہا۔ ''جی ہاں، بدل گیا ہے۔ لیکن آپ کو کس نے بتایا؟''

''کسی نے نہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''سالن میں سے پہلے کالے بال نکلتے تھے، اب سفید بال نکلا ہے۔'' (کلثمہ زہرہ، لاہور)

ایک جہاز کافی بلندی پر اڑ رہا تھا کہ پائلٹ اچانک زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ لوگوں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو کھل کھلا کر بولا۔ ''میں تو یہ سوچ کر ہنس رہا ہوں کہ جب پاگل خانے والوں کو پتا چلے گا کہ میں پاگل خانے سے فرار ہو گیا ہوں تو کتنا مزا آئے گا۔''

☆

دو آدمی گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ان میں سے ایک بولا۔ ''معاف کیجئے، میں کچھ اونچا ضرور سنتا ہوں لیکن آج تو ایسا لگتا ہے کہ بالکل بہرا ہو گیا۔ آپ اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں مگر مجھے ایک بھی لفظ سنائی نہیں دیا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میں باتیں نہیں کر رہا، چیونگم کھا رہا ہوں۔''

(محمد اشرف خاں، لنگر منڈی)

کسی بس میں ایک بڑھیا سفر کر رہی تھی۔ جب بس تھوڑی دور پہنچی تو بڑھیا کنڈیکٹر سے کہنے لگی۔ ''جڑانوالہ آ گیا؟''

کنڈیکٹر: ''نہیں اماں۔''

بس کچھ اور دور گئی تو بڑھیا پھر کہنے لگی۔ ''بچہ، جڑانوالہ آ گیا؟''

کنڈیکٹر: ''نہیں اماں جی۔ ابھی نہیں آیا۔''

جب بس کچھ اور دور گئی تو بڑھیا پوچھنے لگی۔ ''بچہ، جڑانوالہ آ گیا؟''

کنڈیکٹر: ''اماں جی، جب آئے گا تو میں بتا دوں گا۔''

بڑھیا اطمینان سے بیٹھ گئی اور اونگھنے لگی۔ اتنے میں جڑانوالہ گزر چکا تھا۔ جب بس کچھ آگے پہنچی تو بڑھیا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کنڈیکٹر سے پوچھنے لگی۔ ''بچہ، کیا جڑانوالہ آ گیا؟''

کنڈیکٹر: ''اوہو! وہ تو پیچھے رہ گیا۔''

اس نے بس واپس کرائی اور جڑانوالہ کھڑی کر کے کہنے لگا۔ ''اماں، جڑانوالہ آ گیا۔''

بڑھیا نے اپنے پلو سے پڑیا کھولی اور کھا لی۔ کنڈیکٹر کہنے لگا۔ ''اماں، اترو بھی۔''

بڑھیا کہنے لگی۔ ''بیٹا، اب بس چلا دو۔ مجھے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جڑانوالہ جا کر دوائی کھانا۔'' (احور کامران، لاہور)

مریض: ''میں رات بھر سردی سے کانپتا رہا۔''

ڈاکٹر: ''کیا سردی سے دانت بھی بج رہے تھے؟''

مریض: ''اس بات کا تو مجھے علم نہیں، کیوں کہ وہ میز پر پڑے تھے۔''

☆

دفتر میں کلرکوں کے مجمع میں ایک افسر گھسے پٹے لطیفے سنا رہا تھا۔ جنہیں سن کر کلرک خواہ مخواہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے، لیکن ایک کلرک بالکل سنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔

''تم کیوں نہیں ہنستے؟'' افسر نے کہا۔

''مجھے ہنسنے کی ضرورت نہیں جناب، میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔ (محمد احمد، لاہور)

ایک دیہاتی کے گھر ایک چور گھس آیا۔ اس نے دیہاتی اور اس کی بیوی کو خوب مارا اور سارا سامان لوٹ کر چلتا بنا۔ صبح کو تھانے دار نے دیہاتی سے پوچھا: ''جب چور گھر میں گھسا تو اس وقت کیا بجا تھا؟''

دیہاتی نے جواب دیا: ''جی چار ڈنڈے مجھے بجے تھے اور دو میری بیوی کو۔'' (بشریٰ اصغر، ملتان)

☆☆☆

پہلے تولو، پھر بولو

منظور آفاقی

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جنگل کا بادشاہ شیر بیمار ہوگیا۔ تمام جانور اس کی عیادت اور تیمارداری کے لیے گئے لیکن لومڑی کسی وجہ سے فوراً نہ جاسکی۔ بھیڑیا اس سے خار کھاتا تھا۔ اس نے بادشاہ کے کان بھرے۔ ''حضور! یہ نیچ ذات کی لومڑی اپنے آپ کو کوئی بڑی اہم چیز سمجھتی ہے۔ اسے اپنی ذرا سی عقل پر بڑا ناز ہے۔ یہ اتنی مغرور ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یہی دیکھیے ناں کہ آپ کی بیماری کا سن کر چھوٹے بڑے سبھی جانور بھاگے چلے آئے ہیں سوائے اس حقیر مخلوق کے جسے بھٹ میں سونے اور آرام کرنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

شیر نے لومڑی کی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کیا اور بھیڑیے کو تاکید کی کہ جب لومڑی آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ لومڑی آ گئی۔ بھیڑیئے نے بادشاہ کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''حضور! وہ ناہنجار آن پہنچی ہے آج اس کی خوب خبر لیں اور اس کا غرور خاک میں ملا دیں۔''

شیر نے حکم دیا کہ اس کم بخت کو میرے حضور پیش کیا جائے۔ بھیڑیے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے کان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے چلا اور جنگل کی سرکار کے حضور لا کھڑا کیا۔ شیر نے گرج کر پوچھا۔ ''او نابکار! تو دیر سے کیوں آئی ہے؟'' لومڑی بولی۔ ''جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔'' ''کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟'' شیر غرایا۔ لومڑی کہنے لگی۔ ''آقا! آپ کی بیماری کی خبر تو مجھ پر بجلی بن کر گری ہے، میں آپ کی تکلیف پر تڑپ اٹھی ہوں، قربان جاؤں میں آپ کو بیمار دیکھ ہی نہیں سکتی۔ دوسرے جانور شاید خالی ہاتھ آئے ہوں گے لیکن میں آپ کی خدمت میں خالی ہاتھ نہیں آئی بلکہ آپ کے لیے ایک نسخۂ شفا لائی ہوں۔'' ''بہت خوب! بہت خوب! لایئے وہ نسخہ تاکہ میں بیماری سے نجات پاؤں۔'' شیر بولا اور پنجے پھیلا دیے۔

لومڑی بولی۔ ''سرکار! جوں ہی مجھے آپ کی بیماری کی اطلاع ملی میں نے اسی وقت آپ کے علاج کے بارے میں سوچا۔ چناں چہ دس کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچی، اسے آپ کی تکلیف بتائی اور دوائی تجویز کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر نے ایک موٹی سی کتاب کھولی، اس کی ورق گردانی کی، مختلف نسخے دیکھے پھر ایک آسان سا نسخہ تجویز کیا.....''

شیر نے بات کاٹ کر کہا۔ ''کہاں ہے وہ آسان سا نسخہ؟ اری نیک بخت! کچھ دو بھی سہی یا یوں ہی باتیں بناتی رہو گی۔'' لومڑی نے کہا۔ ''واری جاؤں لیجیے نسخہ حاضر ہے۔ ڈاکٹر نے جناب کے لیے یہ رائے دی ہے کہ آپ بھیڑیئے کی زبان کھانے سے بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔'' یہ سن کر شیر نے بھیڑیئے کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا، اس کے جبڑے کھلے، زبان نکالی اور چٹ کر گیا۔ بھیڑیا شیر کی گرفت سے نکلا اور درد کی شدت سے کراہتا ہوا بھاگا۔ عقل مند لومڑی نے آوازہ کسا۔ ''مسٹر بھیڑیے! بادشاہ کے حضور زبان سنبھال کر بات کی ہوتی اور لگائی بجھائی نہ کی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' ☆☆☆☆

شرارت کی پڑیا

صائمہ محبوب

ارتضیٰ کی شرارتیں روز ہی اپنے عروج پر ہوتیں اور گھر والوں کو شکایتیں بھی موصول ہوتی رہتیں۔ کبھی اسکول سے تو کبھی ہمسائیوں سے، کبھی گھر میں موجود ملازمین اور بہن بھائیوں سے تو کبھی دودھ والے سے۔ اور تو اور جانور بھی اس سے پناہ مانگتے۔ نہ جانے روز نت نئی شرارتوں کے خیالات اس کے ذہن میں کہاں سے آتے؟

اس کی امی اور ابو ان شکایتوں سے اکثر پریشان ہو جاتے انہیں ارتضیٰ کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

تھے تو ارتضیٰ میاں صرف دس برس کے مگر بلا کے ذہین۔ ابھی کل ہی اسکول سے شکایت آئی کہ استانی صاحبہ کو چھپکلی اور سانپ سے ڈرانے کے بعد اب اسکول کے اسٹاف کو دھمکی آمیز خط لکھ کر ڈرانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ وہ تو ان کے خط میں موجود املاء کی غلطیوں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ پرنسپل صاحب نے ابا جان کو اسکول بلایا۔ خوب ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اور اسے اسکول سے نکالنے کی دھمکی بھی دے دی گئی۔

ارتضیٰ کے ہم جماعت بھی اس سے خاصے تنگ تھے۔ دوسرے بچوں کا دوپہر کا کھانا کھا جانا یا جیومیٹری باکس نکال لینا تو عام سی باتیں تھیں۔ کبھی وہ بچوں کی کاپیاں ادل بدل کر دیتا تو کبھی آگے بیٹھے بچے کا بستہ کرسی سے اس مضبوطی سے باندھ دیتا کہ چھٹی کے وقت بچے کے ساتھ کرسی بھی رواں دواں ہوتی۔ کسی دن تمام کلاس کی کتابیں بچھے کی سیر کرتی پائی جاتیں تو کبھی کاپیاں باہر پودوں میں آرام کرتی ملتیں۔

ارتضیٰ کو اپنی بلی سے بہت محبت تھی۔ سوفریج سے کھانے پینے کی ہر شے بلی کے پیالے میں منتقل ہو جاتی۔ بلی پر تحقیق بھی جاری رہتی۔ اسے دودھ کے ساتھ ساتھ پھل فروٹ کھانے پر مجبور کیا جاتا۔ اس کی دُم کے ساتھ پٹاخے باندھ کر اس کی رفتار کا جائزہ لیا جاتا۔

ارتضیٰ کے ابو ڈاکٹر مصطفیٰ شہر کے بہت مشہور اور مصروف سرجن تھے۔ انہیں عموماً بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا کم ہی موقع ملتا۔ وہ اپنے 'مار نہیں پیار' والے اصول کو ارتضیٰ کے لیے توڑ چکے تھے۔ جب کوئی بزرگ اس کی شکایت لے کر آتا تو وہ اس کی ٹھکائی بھی لگا دیتے۔ ارتضیٰ کے قریبی گھر میں شیخ صاحب کی پرانی گاڑی عموماً ارتضیٰ کی شرارت کا نشانہ بنتی۔ وہ روز گزرتے گزرتے پوچھتا کہ انکل آپ کی گاڑی کو دھکا لگا دوں۔

شیخ صاحب نے نئی گاڑی خریدی تو ارتضیٰ صاحب اپنی سائیکل پر اس کا مقابلہ کرنے باہر آن پہنچے۔ گاڑی کے ارد گرد چکر لگاتے

لگاتے سائیکل خوب زوردار دھماکے سے گاڑی کے عین سامنے ٹکرا گئی۔ جانے ارتضیٰ کی قسمت زیادہ بری تھی یا شیخ صاحب کی اور گاڑی کی سامنے کی لائٹ ٹوٹ گئی۔ اس حادثے کے عینی گواہ گھر کے گارڈ، چوکی دار اور شیخ صاحب کا ڈرائیور سب ہی تھے۔ سو ارتضیٰ میاں کے لیے حادثے سے انکار کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شیخ صاحب سے معافی بھی مانگی۔ لائٹ کی قیمت بھی ادا کی اور شیخ صاحب کے سامنے ارتضیٰ کی پٹائی بھی کی۔

آج دادا جان رات کو اپنے کمرے میں سونے آئے تو سامنے بستر پر ارتضیٰ میاں لیٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر افسردگی اور شرمندگی لیے۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان خاصے واضح تھے۔

''دادا جان! آج سے میں آپ کے ساتھ ہی سویا کروں گا۔'' ارتضیٰ انہیں دیکھ کر بولا۔

''سب میرے دشمن ہیں۔ اب مجھ سے غلطی ہوگئی تو ابا جان نے مجھے مارا۔ امی بھی خفا ہوگئیں۔ علی اور عثمان بھائی تو ویسے ہی مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ آپا کے کمرے میں چلا جاؤں تو وہ بھی ڈانٹنے لگتی ہیں۔ بس آپ ہی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' اسے آخری جائے پناہ دادا جان کا بستر ہی ملا تھا۔

''ٹھیک ہے میرے بچے آج سے آپ میرے ساتھ ہی سوؤ گے۔'' دادا جان مسکرائے۔ آج میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ انہوں نے پوتے کو خود سے لپٹا لیا۔ ارتضیٰ دادا کا نرم لہجہ اور پیار بھرا انداز دیکھ کر اور بھی زیادہ لپٹ گیا۔

میرے بچے! بہت سال پہلے کی بات ہے کہ ایک بہت غریب بچے کو پانچویں جماعت میں بہت اچھے نمبر لینے پر ایک بڑے اسکول میں مفت داخلہ مل گیا۔ وہ بچہ بہت ذہین تھا مگر بڑے اسکول میں بچے امیر گھرانوں سے آتے تھے۔ ان کے یونی فارم بڑے چمکتے ہوئے صاف ستھرے ہوتے۔ ان کی کتابیں، کاپیاں، سب بہت اچھے ہوتے۔ اس غریب بچے کے پاس ایک ہی پرانا یونی فارم، خستہ حال جوتا اور پھٹا پرانا بستہ ہوتا تھا۔ اس کے ہم جماعت اس سے دُور دُور رہتے۔ اس کا مذاق بھی اُڑاتے۔ کلاس کے سب سے شرارتی بچے نے ایک دن اس کا ٹفن چوری کر لیا۔ جب اس نے وہ ٹفن آدھی چھٹی کے وقت کھولا تو وہ خالی تھا۔ غریب بچہ صرف اپنی خودداری کے لیے وہ خالی ڈبہ لایا کرتا تھا۔ شرارتی بچے کو پہلی بار خود پر غصہ آیا اور وہ شرمندہ بھی ہوا۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہ اس بچے کی کتابیں اور کاپیاں بھی چھپا چکا تھا۔ اگلے روز وہ اپنے گھر سے دو ٹفن لایا۔ ایک اپنا اور دوسرا اس غریب بچے کے لیے۔ جس خفیہ طریقے سے وہ چیزیں چوری کرتا تھا، اس نے اسی احتیاط سے اس کے بستے میں ٹفن واپس رکھ دیا۔ بریک کے بعد اسے اپنے غریب دوست کے چہرے پر خوشی کی ایسی کرن نظر آئی جو اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ اب وہ روز ہی دگنا لنچ لانے لگا اور چپکے سے اپنے ساتھی کے بستے میں ڈالنے لگا۔ اب وہ اکثر نیا قلم، کاپی، رجسٹر اور ضرورت کی چیزیں جو اپنے لیے خریدتا اپنے دوست کے بستے میں بھی ڈال دیتا۔ اگلے برس جب اس نے اپنے لیے نئی وردی سلوائی تو اپنے دوست کے ناپ کی دو وردیاں سلوا کر اس کے گھر کے پتے پر پارسل کر دیں۔ اپنے نئے جوتوں کے ساتھ دوست کے لیے بھی نئے جوتے لے کر اس کے گھر بھجوا دیے۔ وہ یہ سب کام بہت احتیاط سے کرتا رہا۔ کہ اس کے کسی ہم جماعت، استاد یا دوست کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ دونوں نے اسی تعاون کے ساتھ میٹرک کیا۔ کالج میں غریب لڑکے کو وظیفہ بھی ملنے لگا مگر دوست کا تعاون اب بھی جاری تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ غریب لڑکا ڈاکٹر بن گیا اور پھر ایک مشہور سرجن۔ اب اس کی شان دار کوٹھی ہے۔ ایک بہت بڑا ذاتی اسپتال ہے۔ لمبی لمبی دو تین گاڑیاں ہیں اور پیارے پیارے چار بچے بھی ہیں۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا بہت شرارتی ہے۔ جب وہ شرارت میں کسی کا نقصان کر دیتا ہے تو وہ ڈاکٹر بہت غصہ کرتا ہے۔ مارتا ہے۔ اور وہ بچہ مار کھا کر باپ سے ناراض ہو جاتا ہے۔''

''دادا جان! وہ غریب لڑکا میرے بابا ڈاکٹر مصطفیٰ ہی ہیں ناں۔ اور ان کا شرارتی بیٹا میں ہوں۔'' ارتضیٰ فوراً اٹھ بیٹھا۔

ہاں بالکل یہ سب آسائشیں تمہارے ابو نے بہت محنت سے حاصل کی ہیں اگر وہ امیر لڑکا تمہاری طرح ہر ایک کو تنگ کر کے خوش ہوتا تو بھلا تمہارا باپ اس مقام تک پہنچ پاتا؟ بیٹا یہ بھوک، غربت اور بے چارگی سب بہت بُری چیزیں ہیں اور ان کے ساتھ اگر تمہاری شرارتوں سے دوسروں کی مشکلات بڑھ جائیں تو کتنی بُری بات ہوگی؟

تم نے اپنی چھوٹی سی شرارت سے شیخ صاحب کی نئی گاڑی کا

کتنا بڑا نقصان کر دیا۔ تمہارے اس دھمکی والے خط سے تمہارے اسکول کے چوکی دار اور گارڈ کی نوکری خطرے میں پڑ گئی۔ دودھ والے کی سائیکل کی ہوا نکالنے سے اس کا اس دن کا دودھ خراب ہو گیا، وہ مقررہ وقت پر مقررہ لوگوں میں نہیں پہنچا سکا اور بلی کی دم سے پٹاخے باندھنے سے بلی کو شدید چوٹ لگ سکتی تھی۔ اگر ہمارے کاموں سے دوسروں کی دل آزاری ہو تو کتنا برا کام ہے۔"

"دادا جان! مجھے دوسروں کو پریشان دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔" ارتضیٰ معصومیت سے بولا۔

"بیٹے کسی کی مشکل میں ایک دم آسانی کر کے دیکھو۔ اسے دیکھ کر تمہیں اور بھی زیادہ مزہ آئے گا۔" دادا جان مسکرا کر بولے۔

"وہ کیسے دادا جان؟" ارتضیٰ نے سوال کیا۔

"جیسے کل تمہارے ابو سے دوا لینے اور علاج کرانے تمہارے قاری صاحب آئے تھے۔ مصطفیٰ نے انہیں اپنے اسپتال بلا کر سارے ٹیسٹ کیے، تشخیص کی اور پھر دوا دی اور پھر ان سے بالکل بھی پیسے نہیں لیے۔ یہ سب تمہارے ابو کے لیے تو بہت آسان تھا مگر قاری صاحب کے لیے بہت بڑا مشکل اور مہنگا کام تھا۔ بس جہاں تک ہو سکے دوسروں کے کام آؤ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ احسان کر کے بھول جاؤ۔ نیکی بار بار یاد دلانا بہت بُری بات ہے۔" دادا جان بولے۔

دادا بابا! جب ہم دوسروں کو تنگ کرتے ہیں تب تو وہ ہماری شکایت ہر ایک کے سامنے کرتے ہیں اور ہم اپنی نیکی چھپا کر کریں۔ واہ یہ کیا بات ہوئی۔" ارتضیٰ چمک کر بولا۔

بیٹے! ثواب تو نیکی چھپانے میں ہی ہے۔ دادا جان ارتضیٰ کا ماتھا چوم کر بولے۔

"ٹھیک ہے اب میں بھی دوسروں کو تنگ کرنے کی بجائے ان کی مدد کر کے اس خوشی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کروں گا جو دوسروں کے چہرے پر آتی ہے۔" ارتضیٰ نے فوراً وعدہ کر لیا۔

"ان دوسروں میں تمہاری بلی بھی شامل ہونی چاہیے۔" دادا جان فوراً بولے۔

اور ارتضیٰ ابو اور امی کی مار اور ڈانٹ اور شیخ صاحب کے غصے والے صدمات بھلا کر دادا جان کے بازو پر سر رکھ کر سونے کی کوششیں کرنے لگا۔ ☆☆☆

جناح کیپ کی کہانی

مرزا ابوالحسن اصفہانی کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قربت کا شرف حاصل رہا اور وہ تحریک پاکستان کے بھی روح رواں رہے۔ ان کی انگریزی کتاب Quaid e Azam as I knew him پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی کتاب کے باب (The cap, the flag and the capital) میں ایک واقعہ درج ہے جس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے:

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے بعد ہونے والے جنرل الیکشن میں مسلم لیگ کو خاطر خواہ فتح ہوئی۔ الیکشن کے بعد مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا جلسہ لکھنؤ میں 15 سے 18 اکتوبر 1937ء میں منعقد کیا گیا۔

تقریب کے انتظام اور مہمانانِ خصوصی کی خدمت کی ذمہ داری محمود آباد ریاست کے راجہ نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ بہت بڑا پنڈال نہایت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا جس میں پچاس ہزار (50,000) افراد اپنے قائد محمد علی جناح اور دیگر کو سننے کے لیے جمع تھے۔

قائداعظم دیگر اکابرین کے ہمراہ قیصر باغ کے علاقے میں واقع وسیع و عریض محمود آباد ہاؤس میں مقیم تھے۔ لیکن راجہ صاحب اور چوہدری خلیق الزمان کے ساتھ قائداعظم کے ساتھ موجود تھا اور ایک گھنٹے بعد شروع ہونے والے جلسے کی ترتیب پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد نواب اسماعیل خان بھی آ گئے اور گفتگو میں شامل ہو گئے۔ نواب صاحب اپنے روایتی لباس میں تھے جس کا حصہ یہ ٹوپی بھی تھی۔ قائداعظم کو یہ ٹوپی بہت پسند آئی اور انہوں نے نواب صاحب سے پوچھا کہ اگر مناسب ہو تو وہ ٹوپی اتار کر ذرا دکھا دیں۔ نواب اسماعیل خان نے نہ صرف ٹوپی اتار کر قائداعظم کو دی بلکہ یہ گزارش کی کہ وہ اس کو پہنیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ ان پر کیسی لگتی ہے۔

جب قائداعظم نے وہ ٹوپی پہنی تو ان پر بہت جچ رہی تھی۔ ہماری طرف سے تعریف سن کر قائداعظم ساتھ والے کمرے میں لگے شیشے میں خود کو دیکھنے لگے۔ جب قائداعظم واپس ہم میں آ کر بیٹھے تو ہم میں سے ایک نے قائد سے پُرزور فرمائش کی کہ وہ یہی ٹوپی پہن کر جلسے میں شریک ہوں۔ قائداعظم نے یہ تجویز مان لی اور ہم سب جلسہ گاہ کی طرف چل پڑے۔

مجھے وہ مجمع اب بھی یاد ہے۔ ان کے وہ مسکراتے چہرے اور "اللہ اکبر" کے نعرے جن سے پنڈال کی فضا گونج رہی تھی۔ ہر کوئی قائداعظم کی ٹوپی اور شیروانی دیکھ کر سب ہی بہت پُرتعریف نظروں سے قائد کو دیکھ رہے تھے۔ یہ ٹوپی جناح کیپ کے نام سے مشہور ہو گئی اور 18 اکتوبر کو جلسے کے آخری دن سے پہلے یہ ٹوپی تقریباً ہر مرد کے سر پر تھی۔

(حسن جاوید گوریجہ، اسلام آباد)

ندامت کے آنسو

ساجد کمبوہ

یہ ایک بہت رقت آمیز منظر تھا۔ ایک بوڑھی عورت کشتی والوں کی منتیں کر رہی تھی کہ خدا کے لیے مجھے میرے بیٹے اور بہو کے پاس لے جاؤ۔ وہ دوسری کشتی سے چلے گئے ہیں۔ بوڑھی عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ کشتی والوں سے التجائیں کر رہی تھی۔

"ہٹ جا مائی" ایک کشتی والا اسے حقارت سے دھکیل رہا تھا۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی لوگ ہجوم کی صورت کشتی والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے کشتی میں سوار ہو رہے تھے۔ کشتی والے ایسے کھڑے تھے جیسے کسی فلم کا ڈان کھڑا ہوتا ہے۔ ابوبکر بھی وہیں تھا اس سے اس بوڑھی عورت کی بے بسی نہ دیکھی گئی۔ اس نے اپنے موبائل کیمرے کا رخ عورت کی طرف موڑا اور تصاویر بنانے لگا۔

یہ دریائے جہلم کے قریب ایک گاؤں کا منظر تھا، جہاں اچانک سیلاب نے بڑی تباہی مچائی ہوئی تھی۔ بارشوں کا یہ عالم تھا لگتا تھا کہ زمین بھی پانی اگل رہی ہے۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے اپنے گھربار، فصلیں اور کھیت چھوڑ کر گٹھڑیاں اٹھائے کشتی والوں کی مدد سے محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ بے حس کشتی والے ان بے چاروں کو مزید برباد کر رہے تھے، ان مجبور لوگوں سے دو ہزار فی کس کے حساب سے رقم وصول کرتے پھر کشتی میں سوار ہونے دیتے۔ حالاں کہ عام حالات میں اتنے سفر کا کرایہ سو ڈیڑھ سو روپیہ تھا۔ جن کے پاس نقد رقم نہ تھی ان سے قیمتی پارچہ جات، زیور اور مال مویشی بھی لے رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ عورتوں نے بچے اٹھائے ہوئے تھے، گٹھڑیاں سروں پر رکھی ہوئی تھیں کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ وہ بے سہارا عورت روئے جا رہی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اسے بیٹے بہو اور پوتوں سے ملا دے۔

ابوبکر کو بچپن سے ہی فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

برسوں پہلے بھی یہی منظر تھا۔ ہر طرف سیلاب نے تباہی مچائی ہوئی تھی وہ ان دنوں لاہور سے اپنے ماموں جان کے پاس آیا ہوا تھا۔ ان کا گاؤں کافی بلندی پر تھا۔ اس کے تایا جان نے انگلستان سے "یاشیکا کیمرہ" لینز والا بھیجا تھا۔ جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتا تھا حالاں کہ اس وقت اس کی عمر محض آٹھ نو برس تھی۔ وہ دروازے پر کھڑا سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ رہا تھا، اس نے دیکھا کہ لوگوں کا سامان پانی میں بہتا آ رہا ہے۔ انہی میں دور سے ایک عورت پانی کے زور پر بہتی آ رہی تھی، اس کی گود میں چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ جوں جوں وہ عورت قریب آتی گئی۔ ابوبکر نے دیکھا کہ اس عورت نے بچے کو سینے سے چمٹایا ہوا تھا۔ پانی گہرا ہوتا گیا، اس نے بچے کو

کندھوں پر بٹھا لیا۔ پانی کا تیز ریلا آیا۔ پانی عورت کے کندھوں تک آ گیا۔ عورت نے بچے کو بازوؤں سے اونچا کر دیا۔ وہ اب ٹھوڑی تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابوبکر نے فوراً کیمرہ سیدھا کیا اور اس عورت کی تصویر بنا لی جس نے اپنا بچہ بازوؤں پر اٹھایا ہوا تھا۔

اتنی دیر میں کوئی پانی میں کودا۔ اس نے عورت اور بچے کو پکڑ لیا۔ کچھ آگے جا کر درخت کو پکڑ لیا۔ پانی کا خطرناک ریلا گزر گیا۔ ابوبکر نے دیکھا وہ اس کا ماموں تھا جسے اللہ تعالیٰ نے وسیلا بنایا تھا۔ وہ جلدی سے اسے گھر لائے، اس عورت کو دودھ گرم کر کے پلایا۔ بچے کو فیڈر دیا۔ ریڈیو پر علاقے کی صورت حال کا پتا چلا کہ انڈیا نے بھی اپنی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانی چھوڑ دیا ہے جو چند گھنٹوں میں مزید بربادی لا سکتا ہے۔

عورت نے بتایا کہ وہ فلاں گاؤں سے تعلق رکھتی ہے جو چند میل دُور تھا اور اس گاؤں میں آنے سے پہلے اس گاؤں کے قریب سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس عورت کے عزیز دوسرے گاؤں میں تھے۔ ابوبکر کے ماموں نے اسے فوجی کشتی میں سوار کرا کر اسے گاؤں میں بھیج دیا اور پھر خود سیلاب کا ریلا آنے سے پہلے محفوظ مقام پر منتقل ہو گئے۔ عورت نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کا تین سال کا بیٹا اور خاوند لاپتا ہیں۔ سب نے ان کے ملنے کی دعا بھی کی تھی۔

ابوبکر کی اتاری ہوئی وہ تصویر ملکی و غیر ملکی اخبارات میں اس کیپشن کے ساتھ شائع ہوئی کہ کس طرح ایک ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے اور مصیبت سے کس طرح بچاتی ہے۔ اس تصویر کو سال کی بہترین تصویر کا اعزاز ملا اور ابوبکر کو کم سن فوٹو گرافر اور بہترین تصویر پر بہت سے انعامات اور شیلڈز بھی ملیں۔

اس واقعہ کے بعد ابوبکر کئی مرتبہ اپنے ماموں کے ہاں آیا۔ اب گھر میں لگی تصویر دھندلی ہو گئی تھی۔ اس کی وہ اہمیت نہ رہی کیوں کہ آج کل جدید موبائل کیمرہ سے تصاویر بنائی جاتی ہیں۔ اسی وقت وٹس ایپ کر دی جاتی ہے ایسی تصاویر چارمنگ بھی ہوتی ہیں۔ گو اس کے بعد ابوبکر کی کئی تصاویر اور ویڈیوز کو پذیرائی ملی مگر اس تصویر جیسی نہیں۔ اب تصویر ایک کونے لگی تھی۔ وہ بھی ابوبکر کی خوشنودی کی خاطر ورنہ ایسی محبت اب کہاں؟

وہ اکثر سوچتا رہا کہ وہ یہ تصویر اس عورت اور بچے کو دے دے۔ مگر ہر بار لانا بھول جاتا۔ ایک بار لایا بھی تو گاؤں میں وہ عورت اور بچہ نہ ملے۔ وہ کسی شادی میں گئے ہوئے۔ ابوبکر تصویر انہیں دینا چاہتا تھا۔ مجبوراً واپس لے آیا۔ اس بار ماموں کے ہاں جانے کا پروگرام بنا۔ اس نے وہ تصویر چار پانچ دن پہلے ہی بیگ میں رکھ لی۔ ابھی وہ ماموں کے گاؤں پہنچا بھی نہ تھا کہ سیلاب میں پھنس گیا۔ اسے یاد آیا کہ یہ اسی عورت اور بچے کا گاؤں ہے۔ وہ خود افراتفری میں تھے لہٰذا اب انہیں تلاش کرنا فضول تھا۔

ابوبکر اپنے موبائل کیمرے سے ویڈیو بناتے ہوئے اس بوڑھی عورت کی بے بسی دیکھ رہا تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور کشتی والوں سے کہا۔ ”اس بے چاری بوڑھی عورت کو بھی لے جاؤ، یہ اپنے بیٹے اور پوتوں کے لیے ترس.....“

”تمہیں ہمدردی ہے تو تم کرایہ دے دو۔“ کشتی والے نے بے رخی سے کہا۔

”بھائی میں تو خود مسافر ہوں اور سیلاب میں گھر گیا ہوں ورنہ یہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔“ ابوبکر نے جواب دیا۔

”اچھا ایسا کرو مجھ سے پانچ سو روپے لے لو اور اس کو لے جاؤ۔ اس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر کشتی والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا مگر کشتی والے نہ مانے۔ وہ دو ہزار پر اصرار کرنے لگے۔ اس پر کچھ ہم درد لوگوں نے سو پچاس ڈال کر پانچ سو پورے کیے یوں ایک ہزار ہو گیا۔ کشتی والے بڑی مشکل سے مانے۔ یوں وہ بوڑھی اور مجبور عورت کشتی میں بیٹھی۔ کشتی پر سوار ہوتے ہی اس کی ہچکی بندھ گئی وہ زار و قطار رو رہی تھی ابوبکر نے کہا۔ ”ماں جی! حوصلہ رکھیں آپ جلد ہی اپنے بیٹے اور پوتوں کے پاس ہوں گی بس کچھ دیر.....“

اس پر اس بوڑھی عورت نے کہا۔ ”رونا تو اس بات کا ہے کہ میرا بیٹا ان پیسوں کی خاطر مجھے یہ کہہ کر یہاں چھوڑ گیا ہے کہ جتنے تیرے پیسے کرایہ میں دینے ہیں۔ اتنے پیسوں سے اپنے بچوں کے لیے راشن نہ لے لوں گا۔ بیٹا تمہیں اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے ورنہ میں ادھر ہی.....“

”کیا کہا ماں جی؟“ وہ آپ کو جان بوجھ کر یہاں چھوڑ گیا ہے؟“ کیا وہ آپ کا سوتیلا بیٹا تھا؟“ ابوبکر نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! وہ میرا سگا اور ایک ہی بیٹا ہے برسوں پہلے

کے سیلاب میں اس کا باپ اور بھائی سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے میری اور اس کی جان بچی تھی۔ وہ بھی اللہ نے ایک انسان کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا ورنہ میں نے تو ہاتھوں تک اسے اٹھا لیا تھا۔ ہم ڈوبنے والے تھے اور..... یہ سنتے ہی ابوبکر کو وہ تصویر یاد آ گئی جو بیگ میں رکھی تھی۔ اس نے فوراً وہ تصویر نکالی اور اس بوڑھی عورت کو دکھائی۔ تصویر دیکھتے ہی وہ بلند آواز سے رونے لگی اور بتایا کہ یہ تصویر اسی کی ہے۔ وہ بے اختیار تصویر کو سینے سے لگائے ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ کشتی میں سوار دوسرے لوگ بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ روتے روتے کچھ دیر بعد وہ بوڑھی عورت غش کھا کر گری اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی یہ دیکھ کر سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ابوبکر نے اس بوڑھی عورت کی خاطر اپنا سفر طویل کر دیا، وہ اس کی ڈیڈ باڈی (جسدِ خاکی، لاش) لے کر اس گاؤں میں گیا جہاں اس کا بیٹا، بہو اور پوتے رہتے تھے۔ ابوبکر نے انہیں بتایا کہ اس کی والدہ کی وفات کن حالات میں ہوئی ہے۔ ماں کے سینے سے لگی وہ تصویر دیکھ کر اس کا بیٹا بھی رونے لگا۔

"مجھ سے کیا خطا ہوئی۔ میں نے دنیاوی لالچ میں آ کر اپنی جنت کھو دی ہے کاش....."

اس پر ابوبکر نے کہا۔ "مگر اب ان کا کوئی فائدہ نہیں جب وقت تھا تو تم انہیں بے یار و مددگار چھوڑ آئے....."

مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے یہ کیا ظلم کیا۔ میری ماں نے میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اور میں بدقسمت ان کی قدر نہ کر سکا اور انہیں....."

"ماں تو نام ہی محبت کا ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ اس کا کوئی بدل نہیں۔ اب تم ساری عمر بھی روتے رہو گے تو فضول ہے۔ ہم زندوں کی قدر نہیں کرتے اور مرنے کے بعد انہیں رونے کا کیا فائدہ؟" یہ کہہ کر ابوبکر اپنی آنکھیں صاف کرتا ہوا واپس آ گیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے والدین کی قدر کرنے ان کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ☆☆☆

بیاضِ دل

ہارون نے کہا وقت رحیل اپنے پسر سے
جائے گا کبھی تو بھی اسے راہ گزر سے
پوشیدہ کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلمان کی نظر سے

(شازیہ ہاشم میواتی، کنڈیالہ خاص)

کسی کی رہائش نظر نہیں آئی۔'' معاذ نے کہا۔ ''واقعی دُور دُور تک باقاعدہ گھر تو نہیں بنے ہوئے۔ یہاں لوگ بہت عرصہ پہلے رہتے رہے تھے لیکن پھر یہاں جنگلیں شروع ہوگئیں اور گھروں کو آگ لگنا شروع ہوگئی اور اب یہ ایک تباہ حال علاقہ ہے۔ یہ اس شخص کے لیے رہنے کو مناسب جگہ ہے جو تنہا رہنا چاہتا ہو اور کوئی چھٹی گزارنا چاہتا ہو۔'' وہ چٹانوں کے اوپر چلتے رہے، ککی ان کے سروں کے اوپر اُڑ رہا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سمندری پرندوں کی طرح آوازیں نکال کر سمندری بگلوں کو حیران کر دیتا۔ معاذ کو ایک جھاڑی میں ایک غیر معمولی جھینگر نظر آیا جو اس نے تزئین کے بھرپور احتجاج کے باوجود اُٹھا لیا۔ اسی طرح اس نے جیب میں ایک چھپکلی بھی ڈال لی۔ یہ سب دیکھنے کے بعد تزئین اب اس سے خاصی دُور رہ کر چل رہی تھی۔ نایاب بھی پریشان تھی۔

نایاب کو زندہ حشرات الارض سے اتنا خوف نہیں آتا تھا لیکن وہ یہ بھی پسند نہیں کرتی تھی کہ معاذ جیب میں جھینگر اور چھپکلی ڈال کر پھرے یا وہ نایاب کو درخواست کرے کہ وہ یہ چیزیں پکڑ کر گھر تک لے جائے کیوں کہ معاذ کا کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی جیب میں کوئی اور ایسا جاندار بھی ہو جو جھینگر اور چھپکلی کو جیب میں ڈالنے پر چٹ کر جائے۔ وہ سب خوشی خوشی جا رہے تھے، تند و تیز سمندری ہوا انہیں مزا دے رہی تھی۔ سمندر نے ساری آب و ہوا نمکین کی ہوئی تھی اور سمندر کی بڑی بڑی لہروں نے نیچے ساحل پر شور مچا رکھا تھا۔ ان کے پیروں کے نیچے نرم نرم گھاس آ رہا تھا اور آسمان پر بے شمار پرندے اُڑ رہے تھے۔ یہ بہت مزے کی چھٹیاں تھیں۔ پھر وہ چٹانوں کے اس حصہ پر پہنچے جہاں یہ چٹانیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے انہیں بالکل کناروں پر چلنا پڑا۔ عزیق کہنے لگا۔ ''مجھے تو سمندر میں دُور تک کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی۔'' معاذ نے پوچھا۔ ''یاد کرو عزیق! کیا وہ تمہارا وہم تو نہیں تھا، یہ بہت عجیب بات ہے۔ آج کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا کیوں کہ اتنی بڑی کشتی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتی۔'' نایاب بولی۔ ''وہ دیکھو نیچے ایک دراڑ نظر آ رہی ہے جہاں سے روشنی چھن چھن کر ساحل سمندر پر آ رہی ہے، آؤ وہاں جا کر پکنک مناتے ہیں۔ وہاں ہم سمندر میں نہا بھی سکیں گے۔ یہاں ہوا بہت تند و تیز ہے۔ مجھے تو سانس چڑھ رہی ہے اور چلا بھی نہیں جا رہا۔ وہ سب عمودی چٹانوں سے نیچے اُترنے لگے۔ لڑکے آگے تھے اور لڑکیاں پیچھے، کبھی کبھی ان کے پیر پھسلتے لیکن وہ پہاڑوں پر چڑھنے کے عادی تھے، لہٰذا آسانی سے چٹانوں سے نیچے اُتر آئے۔ یہاں وہ تند ہوا کے زور سے محفوظ تھے، خاموشی بھی تھی اور اتنی ٹھنڈ بھی نہیں تھی۔ بچوں نے سویٹر اُتار

لیے اور پانی میں کھیلنے کے لیے سمندر میں گھس گئے۔ معاذ بہت اچھا تیراک تھا، تیرتا ہوا ان سیاہ چٹانوں تک اکیلا چلا گیا جو ساحل سے کچھ دُور سمندر میں کھڑی تھیں۔ وہ بہت اونچی تھیں اور ان کے پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ معاذ تیرتا ہوا وہاں تک پہنچا اور پھر ان چٹانوں کے اوپر چڑھ گیا اور وہاں کھڑے ہو کر اس نے دوسری سمت دیکھا تو اسے اچانک کشتی نظر آ گئی۔

وہاں ایک محفوظ لگر تھی جہاں تک لہریں اپنا زور نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کشتی کو اس لگر کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ یہ وہ کشتی تھی جسے عتریق نے ایک دن پہلے دیکھا تھا اور کوئی بھی اس کشتی کو نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ معاذ کی طرح ان چٹانوں پر نہ چڑھتا کیوں کہ ساحل سمندر سے ان سیاہ چٹانوں کے پیچھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ معاذ کے منہ سے حیرت سے ایک سیٹی کی آواز نکلی۔ وہ کشتی کے پاس چلا گیا۔ یہ بہت خوبصورت بادبانی کشتی تھی اور صغیر کی کشتی جتنی ہی بڑی تھی اس کشتی کا نام بحری عقاب تھا۔ اس کے ساتھ دو پتوار بھی تھے۔ معاذ نے حیران ہو کر کہا۔ ”کیا حیران کن جگہ ہے جہاں کشتی باندھی جا سکتی ہے، بالکل چٹانوں کے پیچھے جہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔ یہ جس کی بھی کشتی ہے اسے جب بھی کشتی کی ضرورت پڑتی ہوگی، اسے لے جانے کے لیے تیر کر آنا پڑتا ہوگا لیکن اس کا مالک کون ہے۔ ابھی تو اس کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا، تب تک سبھی بچے بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور کشتی کو دیکھ رہے تھے۔ معاذ کہنے لگا۔ ”ہم کھانا کھا لیں، پھر ہم اسے بغور دیکھیں گے۔“ آؤ واپس ساحل پر چلیں، تب ہی ہم اپنے پکنک اور مہم جوئی کے پروگرام علیحدہ علیحدہ کر سکیں گے اور کشتی کے مالک سے بھی مل سکیں گے۔“ پھر وہ تیرتے ہوئے واپس ساحل سمندر پر پہنچے، سوکھے ہوئے کپڑے پہنے اور پھر وہ سینڈوچ، چاکلیٹ اور پھل کھانے بیٹھ گئے جو چچی نے ان کو دیے تھے۔ انہیں سورج کی تمازت بہت مزا دے رہی تھی کیوں کہ تیراکی سے وہ تھک چکے تھے اور انہیں شدت سے بھوک اور پیاس لگ رہی تھی، اس لیے کھانا کھاتے ہوئے وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔ نایاب نے سینڈوچ کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور کہنے لگی۔ ”بھوک زیادہ لگی ہو تو کھانے کا بہت لطف آتا ہے۔“ عتریق کہنے لگا۔ ”مجھے تو ہر وقت بھوک لگتی ہے، اچھا کیکی اب چپکے سے بیٹھے رہو، تم نے میرے سیب کا اچھا حصہ تو پہلے ہی کھا لیا ہے۔ میں نے تمہارے لیے سورج مکھی کے بیج جیب میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر وہ تم مجھے نکالنے کا موقع دو تو.....“ کیکی بولا۔ ”بہت بُری بات ہے، بہت بُری بات ہے۔“ وہ اب چچی کی نقل اُتار رہا تھا۔ تزئین کہنے لگی۔ ”اسے چپ کرواؤ!“ وہ بخوبی جانتی تھی کہ جب کیکی کوئی نیا فقرہ سیکھتا تھا تو وہ کئی دفعہ اسے دہراتا رہتا ہے۔ ادھر کیکی لگا ہوا تھا۔ ”بہت بُری بات ہے، بہت بُری بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیکی۔“

”آؤ میں تمہیں سیب کھلاتی ہوں۔“ اس پیش کش نے کیکی کو چپ کروایا۔ وہ تزئین کے پاس اُڑ کر سیب کھانے پہنچا۔ سیب کھانے سے وہ چند لمحوں کے لیے مصروف ہو گیا۔ پھر معاذ اور تزئین کی جنگ چھڑتے چھڑتے رہ گئی کیوں کہ معاذ کی جیب سے جھینگر نکل کر تزئین کی طرف چل پڑا تھا۔ اس نے جھینگر کو دیکھ کر چیخ ماری اور ایک پتھر نما گھونگا اُٹھا کر معاذ کو مارنے ہی والی تھی جب عتریق نے جھینگر اُٹھایا اور دوبارہ معاذ کی جیب میں ڈال دیا۔ اس نے کہا۔ ”تزئین! تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا، اپنے بال ٹھیک کر لو۔ اب دوبارہ کشتی شروع نہیں ہونی چاہیے اور سارا دن صلح صفائی میں ہی گزرنا چاہیے۔“ انہوں نے کھانا بڑی رغبت سے کھایا۔ معاذ نے کہا۔ ”بگلوں کے لیے کچھ نہیں بچ سکا۔ وہ دیکھو ننھا بگلا، اسے ہم سے کوئی جھجک نہیں۔“ عتریق کہنے لگا۔ ”کاش! میرے پاس کیمرہ ہوتا تو میں اس بگلے کی بڑی شان دار تصویریں لیتا۔ ابھی میں کسی پرندے کی کوئی تصویر نہیں بنا سکا، میں کل کیمرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔“ پھر تزئین پھرتی سے کھڑی ہو کر بولی۔ ”اب اُٹھو، اگر ہم نے کشتی کے مالک کو تلاش کرنا ہے تو پھر جلدی کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے میں سب سے پہلے اسے تلاش کر لوں گی۔ پھر وہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے، عتریق اور معاذ ایک سمت کو چل دیے اور لڑکیاں دوسری سمت میں۔

وہ سمندری چٹانوں کے نزدیک رہ کر سمندری ریت پر مٹرگشت کرتے رہے۔ لڑکیاں دُور نہ جا سکیں کیوں کہ ان کے راستے میں بار بار کوئی چٹان آ جاتی جس سے انہیں واپس مڑنا پڑتا لیکن لڑکے اس عمودی چٹان کو بھی عبور کرنے میں کام یاب ہو گئے جو انہیں راہ میں پڑتی تھی۔ جس دراڑ میں بیٹھ کر وہ آرام سے کھانا کھاتے رہے تھے اس کے عقب میں بھی دراڑ تھی لیکن اس کے

ساتھ ساحل نہیں ملتا تھا اور صرف چوٹی تک چٹان ہی تھی۔ لڑکے اس پر چڑھ گئے اور دراڑ میں بنے ایک تالاب میں سمندری مخلوق کو دیکھنے لگے۔ معاذ نے ایک سمندری گھونگا اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ عزیق کہنے لگا۔ ''وہ دیکھو چٹانوں کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ہے اور آؤ وہاں دیکھتے ہیں۔ وہ اس وقفے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ان کی توقع سے کہیں چوڑا تھا۔ چٹانوں کے بیچ سے ایک ندی سمندر کی طرف بہہ رہی تھی۔ عزیق کہنے لگا۔ ''یہ کسی چشمے کا پانی لگتا ہے۔'' اس نے پانی چکھ کر دیکھا تو وہ سمندر کے پانی کی طرح نمکین نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''بودی والے بچے، وہ دیکھو!'' معاذ نے ادھر دیکھا جس طرف عزیق اشارہ کر رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے سے بنے تالاب میں سگریٹ کا ٹکڑا تیر رہا تھا جو ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ عزیق بولا۔ ''کوئی چند لمحے پہلے ہی ادھر تھا ورنہ کوئی لہر کب کی اس ٹکڑے کو بہا کر لے گئی ہوتی۔''

لڑکے اب زیادہ پُرامید ہو کر تلاش کرنے لگے تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ سگریٹ کا ٹکڑا اس شخص کے یہاں ہونے کا ثبوت تھا۔ وہ چٹان کی بڑی دراڑ کے پاس آئے جہاں کچھ ہی اونچائی پر چٹان کی ڈھلوان کے قریب ایک خستہ حال جھونپڑی بنی ہوئی تھی جس کی پشت پر صرف چٹان کی دیوار تھی۔ جھونپڑی کی چھت گزارے کے مطابق مرمت کی گئی تھی۔ اس کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں اور سردیوں میں یہاں رہنا ناممکن تھا لیکن ابھی تو یقینی طور پر وہاں کوئی رہ رہا تھا کیوں کہ باہر ایک سوکھی ہوئی جھاڑی پر کسی نے اپنی قمیص سوکھنے کے لیے ٹانگی ہوئی تھی۔ عزیق سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو، وہ کشتی والا آدمی ادھر رہتا ہے۔ اس نے چھپ کر رہنے کے لیے کتنی اچھی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔'' دونوں لڑکے خاموشی سے اوپر جھونپڑی کے پاس گئے۔ وہ بہت ہی پرانی اور خستہ تھی اور ماضی میں کسی مچھیرے کی ملکیت رہی ہوگی۔ جھونپڑی کے اندر کسی کے سیٹی بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ معاذ پوچھنے لگا۔ ''کیا ہمیں دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے؟'' لیکن ابھی وہ یہ پوچھ ہی رہا تھا کہ جھونپڑی سے کوئی شخص باہر نکل آیا۔ اس کی نظر لڑکوں پر پڑی تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔ لڑکے بھی کچھ بولے بغیر اسے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے لیکن اجنبی کے چہرے کے تاثرات پسندیدگی والے تھے۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کا چہرہ سرخی مائل اور خوش باش تھا۔ چمکتی آنکھیں تھیں اور سر کے سامنے والا حصہ گنجا تھا لیکن کنپٹیوں پر خاصے بال تھے۔ وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا تھا اور اس کی مونچھیں داڑھی کے بغیر چہرے پر تھوڑی تھی جو دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ خوش آمدید! اگر آپ مجھے ملنے آئے ہیں تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔

عزیق نے کہا۔ ''جناب، میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کشتی میں دیکھا تھا، لہٰذا ہم ادھر چلے آئے۔ ہمارا گھر یہاں سے ایک میل دُور ہے، میرا خیال ہے آپ نہیں جانتے۔'' اس شخص نے امید کے خلاف کہا۔ ''میں جانتا ہوں لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہاں صرف میری عمر کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک مرد، ایک خاتون اور ایک عجیب و غریب ملازم۔'' معاذ نے اسے بتایا۔ ''عام طور پر وہاں بڑے ہی رہتے ہیں لیکن چھٹیوں میں میری بہن رہنے کے لیے یہاں آ جاتی ہے۔ یہاں میرے چچا آصف اور چچی رہتے ہیں اور یہ میرے دونوں دوست ہیں، عزیق اور نایاب جو چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارنے آئے ہیں۔ مجھے معاذ کہتے ہیں اور یہ میری بہن تزئین ہے۔'' وہ اُس شخص سے کہنے لگا۔ ''یہاں آ کر کچھ حاصل تو نہیں کیا جا سکتا، آپ کیوں آئے ہیں؟'' پرویز صاحب ایک لمحے کے لیے ہچکچائے، پھر بولے۔ ''میں اصل میں پرندوں کا شوقین ہوں اور یہاں لاتعداد ایسے پرندے ہیں جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔'' عزیق خوشی سے چلایا۔ ''واقعی جناب! آپ بھی پرندوں میں دلچسپی لیتے ہیں، میں تو اس سلسلے میں پاگل ہوں۔ میں نے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ادھر آتے دیکھے ہیں جنہیں میں صرف کتابوں میں دیکھ سکا تھا۔'' پھر عزیق نے جیب سے پرندوں کی ایک فہرست نکال کر دکھائی۔ معاذ اب اس گفتگو سے جمائیاں لے رہا تھا لیکن پرویز صاحب سن رہے تھے، وہ کچھ بولے نہیں۔ وہ عزیق کی پُرجوش گفتگو سے متاثر ضرور تھے۔ عزیق نے پوچھا۔ ''پرویز صاحب! کیا آپ یہاں کسی خاص پرندے کی تلاش میں آئے ہیں۔''

پرویز صاحب سوچنے لگے، پھر ایک شمالی سمندری پرندے کا نام لیا۔ عزیق کی زبان اس پرندے کا نام سن کر گنگ ہو گئی کیوں کہ انہوں نے آک (AUK) کا نام لیا تھا جس کے بارے میں

سمجھا جاتا تھا کہ وہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ اس نے اس بارے میں پرویز صاحب سے پوچھا تو وہ کہنے لگے۔ ”آپ کچھ کہہ نہیں سکتے، ہوسکتا ہے کوئی ایک دو آک ابھی بھی دُنیا میں موجود ہوں اور دُنیا کے لیے یہ ایک معجزے والی بات ہوگی۔“ عزیق کا جوش سے رنگ تمتما اُٹھا۔ اس نے مغرب کی طرف سمندر کو دُور تک دیکھا جہاں دکھ والا جزیرہ دھند میں چھپا ہوا تھا۔ وہ مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اگر آک کا وجود دُنیا میں ہے تو وہ ایسے کسی دُور افتادہ جزیرے پر ہوسکتا ہے جیسے دکھ کا جزیرہ۔ آپ نے امید ہے اس جزیرے کے بارے میں سنا ہوگا۔ وہ بولے۔ ”کیوں نہیں، میں نے سنا ہے۔ میں اس جزیرے پر جانا چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔“ معاذ نے پوچھا۔ ”جناب! کبھی ہم آپ کے ساتھ کشتی کی سیر کو چل سکتے ہیں؟ صغیر، وہی عجیب و غریب ملازم، اس کے پاس بڑی اچھی کشتی ہے لیکن وہ ہمیں استعمال نہیں کرنے دیتا۔ ہمارا دل کرتا ہے کہ ہم مچھلیاں پکڑنے جائیں۔ کیا ہم آپ کو کبھی درخواست کریں کیا، آپ خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتے؟“ پرویز صاحب بولے۔ ”کبھی کبھار! ٹھیک ہے کسی دن اکٹھے چلیں گے اور مچھلیاں پکڑیں گے، تم بھی چلنا اور تمہاری بہنیں بھی۔ تفریح رہے گی۔ ہم دکھ والے جزیرے کے نزدیک جانے کی کوشش کریں گے۔“ لڑکے خوش ہو گئے کہ شکر ہے وہ کشتی کی سیر کرسکیں گے۔ وہ بہنوں کو بتانے گئے۔ عزیق انہیں دیکھ کر دُور سے چلایا۔ ”تزئین، نایاب! آؤ ہم تمہیں اپنے نئے دوست سے ملوائیں۔ یہ ہیں پرویز صاحب!“

دعوت

پرویز صاحب بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔ وہ بہت خوش مزاج شخص تھے۔ انہیں شائستہ مذاق بہت پسند تھا۔ وہ بچی کی حرکات سے زیادہ ناراض بھی نہیں ہوتے تھے۔ اور تو اور وہ معاذ کے ہر وقت بدلتے ہوئے پالتو جانوروں سے بھی زیادہ پریشان نہیں ہوتے تھے، حتیٰ کہ جب معاذ کی جیب سے ایک بہت بڑی مکڑی نکلی اور پرویز صاحب کی دائیں ٹانگ پر پتلون میں سفر کر رہی تھی۔ وہ تب بھی ناراض نہیں ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ ڈالا اور رینگتی ہوئی مکڑی کو پکڑا اور اسے معاذ کے ٹخنے پر چھوڑ دیا۔ تزئین تو ظاہر ہے اس وقت تک مرگی کے دور جیسی کیفیت سے گزر رہی تھی لیکن خدا کا شکر ہے مکڑی کا دل بھی قید میں رہ رہ کر بھر چکا تھا۔ وہ ایک چٹان کی ننھی سی دراڑ میں گھسی اور پھر غائب ہوگئی۔ اب ہر روز بچے پرویز صاحب سے ملنے چلے جاتے تھے۔ وہ کشتی پر سیر کے دوران مچھلیاں پکڑتے اور کئی دفعہ تو پکڑی ہوئی کوئی بڑی سی مچھلی گھر لاتے تو صغیر کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ پرویز صاحب نے انہیں بادبانی کشتی سنبھالنے کا طریقہ بتایا اور کچھ ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو گئے کہ خود ہی کشتی سنبھال سکیں۔ تیز ہوا میں بادبانی کشتی میں سیر کرنا بہت پُرلطف تجربہ تھا۔ معاذ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ تو کسی لانچ کی تیزی سے سفر کرتی ہے۔“

”پرویز صاحب ہم خوش قسمت ہیں جو آپ سا دوست ہمیں مل گیا۔“ عزیق مایوس تھا کیوں کہ پرویز صاحب اب ہر وقت شوق سے پرندوں کے متعلق گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ ہی انہیں کوئی دلچسپی تھی کہ وہ عزیق کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے چٹانوں پر چڑھ کر پرندوں کو دیکھیں لیکن وہ پرندوں کے متعلق کئی نئی خوبصورت کتابیں لے کر آئے تھے جو انہوں نے عزیق کو تحفے میں دی تھیں۔ عزیق نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بالکل نئی ہیں، دیکھیے! اس میں کئی صفحے آپس میں جڑے ہوئے ہیں، وہ بھی ابھی کسی نے علیحدہ نہیں کیے ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے یہ کتابیں خود بھی نہیں پڑھیں لہٰذا پہلے آپ ان کتابوں کو پڑھیے۔“ پرویز صاحب بولے۔ ”کوئی بات نہیں، میں یہ تمہارے لیے ہی لے کر آیا ہوں۔ ان میں سے ایک کتاب میں عظیم پرندے آک کا بھی ذکر ہے لیکن ہوسکتا ہے ہم کبھی بھی اس پرندے کو نہ دیکھ سکیں۔ پچھلے سو سالوں سے کسی نے اس پرندے کو نہیں دیکھا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سگریٹ سلگا لیا تو عزیق پُرامید انداز سے بولا۔ ”لیکن ہوسکتا ہے یہ کسی دُور افتادہ جزیرے جیسے دکھ والے جزیرے پر پائے جاتے ہوں۔ میری خواہش ہے کہ کاش ہم وہاں جاسکیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں، وہاں ہم ہزاروں ایسے پرندے دیکھ سکتے ہیں جنہیں ہم جانتے بھی نہیں ہوں گے۔“ یہ پرندوں کے متعلق ختم نہ ہونے والی گفتگو سے ہمیشہ تزئین اکتا جاتی تھی، اس نے موضوع تبدیل کر دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کل جب ہم مچھلی لے کر گھر گئے تھے تو صغیر کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ وہ بولا۔ ”مچھلیاں کبھی چٹانوں سے نہیں پکڑی جاتیں۔“ (باقی آئندہ)

دوست

حسنات احمد پٹھان

عارف تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے تھانے کی طرف جا رہا تھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑی بات ہوئی ہو ورنہ وہ تو تھانے کے پاس سے نہیں گزرتا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے انسپکٹر سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب میری بائیک چوری ہو گئی ہے۔'' ''جناب کل رات میں اپنے دوست آصف کے ساتھ اقبال آباد گیا جہاں میرے رشتہ داروں کے گھر شادی کا پروگرام تھا، ہم رات گئے تک وہاں رہے اور تقریباً ڈیڑھ بجے گھر واپس آئے۔ میں نے اس وقت اپنی بائیک برآمدے میں کھڑی کی۔ جب صبح دیکھا تو میری بائیک غائب تھی جب کہ کوئی تالوں وغیرہ کے نشانات بھی نہیں تھے۔'' انسپکٹر طارق جو عارف کی باتیں غور سے سن رہے تھے سر جھٹک کر بولے۔ ''کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟'' ''نہیں جناب شک کس پر ہو، محلے میں تو سب اچھے لوگ رہتے ہیں۔'' عارف کی بات سن کر انسپکٹر طارق کرسی سے اٹھے اور بولے: ''چلو پھر وہاں چل کر صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔'' عارف پریشانی کے عالم میں اٹھا۔ جائے حادثہ پر پہنچ کر دونوں جائزہ لینے لگے۔ ''عارف! وہ دیکھو کوئی چیز چمک رہی ہے۔'' انسپکٹر طارق نے اشارہ کیا اور عارف حیرانگی سے دیکھنے لگا۔ ''انسپکٹر صاحب یہ تو ٹوٹی ہوئی گھڑی ہے۔'' عارف نے گھڑی اٹھا لی اور کچھ سوچنے لگا۔ ''کیا ہوا عارف کن سوچوں میں ڈوب گئے؟'' انسپکٹر طارق کی بات سن کر عارف چونک پڑا۔ ''کچھ نہیں جناب عارف اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ۔'' انسپکٹر طارق نے عارف کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب بات یہ ہے کہ ایسی گھڑی تو میرے دوست آصف نے پہنی رکھی تھی۔'' عارف نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ عارف کیا تمہیں اپنے دوست آصف پر شک ہے۔'' انسپکٹر طارق نے پوچھا۔ ''نہیں جناب میرا دوست ایسا کام کیوں کرے گا وہ تو میرا پرانا دوست ہے مجھے اس پر مکمل اعتبار ہے۔'' عارف نے جواب دیا۔ ''عارف ہمیں آصف کے گھر چل کر پتا لگانا چاہیے۔'' ''نہیں جناب آصف میرا بہت اچھا دوست ہے وہ کیا سوچے گا کہ میں نے اس پر شک کیا۔'' عارف نے تیز لہجے میں کہا۔ ''عارف میری بات کو سمجھو، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چور ہے ہمیں پتا تو لگانا چاہیے۔'' انسپکٹر طارق کے اصرار پر عارف چلنے پر راضی ہو گیا اور دونوں عارف کے گھر کی جانب چل پڑے۔ وہ دونوں ابھی راستے میں ہی تھے کہ آصف دکھائی دیا، اس سے پہلے کہ آصف اپنا راستہ بدلتا انسپکٹر طارق نے اسے آواز دی اور آصف رک گیا۔ کہاں جا رہے ہو دوست خیر تو ہے۔'' آصف انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ کچھ دن پہلے عارف نے مجھ سے پانچ ہزار روپے ادھار لیے تھے، آج عارف مجھے راستے میں مل گیا تو میں نے سوچا پیسے لے لوں، عارف کے پاس پیسے نہیں اس لیے مجھے آپ کے پاس لے آیا پیسے دینے کے لیے۔'' انسپکٹر طارق نے جلدی جلدی کہا تو عارف حیرانگی کے عالم میں دیکھنے لگا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انسپکٹر طارق کی بات سن کر آصف نے پانچ ہزار روپے نکال کر انسپکٹر طارق کو دے دیے۔ یہ دیکھ کر عارف بے ساختہ بول اٹھا۔ ''آصف! رات تو تمہارے پاس پانچ سو روپے بھی نہیں تھے اور اب پانچ ہزار کہاں سے آ گئے۔'' ''بس آ گئے یار اس بات کو چھوڑو اچھا میں چلتا ہوں۔'' آصف نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''مائم کیا ہوا ہے آصف؟'' عارف نے پوچھا۔ ''وہ یار میری گھڑی کہیں کھو گئی ہے۔'' آصف کی بات سن کر انسپکٹر طارق نے تھانے فون کر دیا اور کچھ دیر بعد پولیس کی گاڑی آئی اور آصف کو پولیس والے گاڑی میں ڈال کر چلے گئے۔ عارف کو بائیک سے زیادہ دوست کے کھونے کا دکھ ہو رہا تھا۔ انسپکٹر طارق نے عارف کو کہا۔ ''اچھے دوست بناؤ اور خود بھی اچھے بن کر دکھاؤ۔'' انسپکٹر طارق کی بات سن کر عارف نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔

پہلا انعام:195 روپے کی کتب

عمارت

فرحان خنجر، سرگودھا

شیدے ادھر آ! علی نے بریک ٹائم اپنے دوست رشید کو بلاتے ہوئے کہا۔ علی یار مجھے میرے سیدھے نام سے بلایا کرو۔'' رشید نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یار اس میں کیا حرج ہے۔ یہ بھی تو ایک نام ہے۔'' علی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا تمہیں پتا ہے دوسروں کے نام بگاڑنا کتنی معیوب اور بری بات ہے۔''

''چھوڑ یار! تو تو مولویوں کی طرح تقریریں شروع کر دیتا ہے۔'' علی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اوئے تم دونوں کون سی باتیں کر رہے ہو۔ کوئی مجھے بھی بتاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے عمیر بھی ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ ''اوئے کالو میں کل تیرے گھر آیا تھا تو گھر پر وجود نہیں تھا۔'' علی نے لاپروائی سے کہا۔

''پھر وہی الفاظ!'' رشید نے علی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''بس بس بہت ہو گیا۔ آئندہ میرے ساتھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے بڑے آئے مولوی۔'' علی غصے سے پیر پٹختا ہوا کلاس کی طرف چلا گیا۔

علی، رشید اور عمیر تینوں دوست تھے۔ تینوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ کلاس کے لائق ترین لڑکے بھی یہی تینوں تھے۔ دوستی بھی ان کی مثالی تھی۔ تینوں ایک ساتھ نماز پڑھتے، کھیلتے اور ہوم ورک کرتے تھے۔ علی کے سارے گھر والے رشید اور عمیر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ جہاں پر علی میں بہت سی خوبیاں تھیں وہیں پر ایک خامی بھی تھی۔ علی نے لڑکوں کے غلط نام رکھے ہوئے تھے مثلاً رشید کو شیدا عمیر کو سانولے رنگ کی وجہ سے کالا اور فہد کو چھوٹی دنیا کے نام سے پکارتا تھا۔ جیسے ہی چھٹی کی گھنٹی بجی۔ علی جلدی سے کلاس سے نکلنے لگا تو رشید اور عمیر علی کے سامنے آ گئے اور اسے منانے لگے لیکن علی اپنا رستہ تبدیل کر کے کلاس سے باہر نکل گیا۔ رشید اور عمیر نے بھی اپنا اپنا بستہ اٹھایا اور کلاس سے باہر آ گئے۔ پہلے تو تینوں اکٹھے گھر جاتے تھے لیکن آج علی کے ناراض ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو علی کے بغیر گھر جانا پڑا۔ اگلے دن علی جب اسکول گیا تو اسے رشید اور عمیر کہیں نظر نہ آئے۔ علی نے وہ دن بہت مشکل سے گزارا۔ چھٹی کے بعد علی تنہا وضو کر آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اسے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ٹی وی آن کیا تو وہاں تلاوت قرآن پاک لگی ہوئی تھی۔ علی نہ چاہتے ہوئے بھی آیات اور ان کے ترجمے پر غور کرنے لگا۔ اچانک ایک آیت ٹی وی کی اسکرین پر ابھری۔ جس کا ترجمہ یہ تھا۔ ''اے ایمان والو! ایک دوسرے کو برے ناموں سے مت پکارو۔'' اس کے بعد مولوی صاحب نے اس آیات کی تفسیر کی۔ یہ سنتے ہی علی کے ذہن میں رشید کی ساری نصیحتیں گونجنے لگیں اور وہ اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی علی نے دروازہ کھولا تو سامنے رشید اور عمیر کھڑے تھے۔ علی نے انہیں اندر بٹھایا اور ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

تو پیارے بچو! اگر آپ بھی ایسی عادت میں مبتلا ہیں اور آپ کا دوست آپ کو روکتا ہے تو آپ بھی علی کی طرح معافی مانگ لیں۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

زندگی کے بدلتے رخ

تقریم آصف، لاہور

گاڑی اونچی نیچی سڑک پر ہچکولے لیتی ہوئی جا رہی تھی۔ شامیر کا ذہن گھر سے آنے والی فون کال میں الجھا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی گھبرا رہا تھا کہ اچانک اپنی امی کی کال پر لرزتی آواز سنی تو اس کی حالت بدتر ہو گئی۔ سامنے سے ایک گاڑی آ رہی تھی، اس سے بچنے کے لیے شامیر نے گاڑی موڑی تو ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ لوگ اسے اسپتال لے گئے۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اسے ایک ہی دن میں ہوش آنا دشوار تھا۔ اسے ڈاکٹر نے اس کی بیٹی کر دی۔ اگلے دن صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر دیکھ کر شامیر اچانک اٹھ گیا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا مگر کانوں میں ماں کی آواز بھی گونج رہی تھی۔ ''بیٹا گھر آ جا، جلدی گھر واپس آ جا۔'' اس نے فوراً اٹھنے کی کوشش کی مگر بستر پر گر گیا۔ ڈاکٹر کے آتے ہی اس نے چھٹی کی درخواست کی۔ اب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ باہر گاڑیوں کا رش دیکھ کر اور گھبرا گیا۔ گھر میں جا کر دیکھا تو لوگوں کا ہجوم، چیخ پکار اور سفید کفن میں لپٹا بچہ دیکھ کر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور اسے دیکھتے ہی شامیر کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ آنسو تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ تو اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا تھا۔ شامیر کا ایک ہی بے حد پیارا اور لاڈلا چار سالہ بیٹا تھا۔ اس کے بچے کو کینسر تھا۔ شامیر نے دنیا کے ہر کونے سے اس کا علاج کروانے کی کوشش کی مگر کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسے یہ دکھ کھائے جا رہے تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی نے نئے رخ بدلے۔ چند ماہ بعد شامیر کی ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ نیک خاتون تھی۔ اسے نہ تو ماں کی قدر تھی اور نا ہی اس سے کوئی لگاؤ، صرف پیسوں سے محبت کرتا رہا۔ زندگی بھر ماں سے نافرمانی اور بدتمیزی کرتا رہا۔ اب وہ بھی گزر گئی۔ بزنس میں بھی نقصان ہوتا جا رہا تھا اور موقع کا فائدہ اٹھا کر ملازم بھی دھوکہ دینے لگے۔ قسمت و نصیب کے کھیل میں وہ نقصان میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بالکل بوکھلا گیا تھا۔ اسے چند ماہ پہلے ہونے والے تمام واقعات فلم کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ شامیر پیسوں کا بہت لالچی تھا۔ اس

لیے اس نے حرام کمانا شروع کر دیا۔ وہ گھر والوں کی آنکھوں میں اس معاملے میں دھول ڈالتا رہا اور انہیں کانوں کان خبر نہ ہونے دے، پر شامیر کی ماں کو شک ہو گیا تھا۔ شامیر کے حرام مال اور دھوکے نے بہت سے لوگوں کے گھرانے تباہ کر دیے تھے۔ ان کی شکلیں ان کے ذہن میں گھوم رہیں تھیں۔ وہ پانی پانی ہو گیا۔ ہر اس غریب کے بہے آنسو جس نے گڑگڑا کر اپنے بچوں کی اس سے روزی مانگی تھی، جس کی بیوی بچے بیمار زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے اس کے آنسو تیزاب کی طرح شامیر کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ جس دردناک اور تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا تھا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کو زندگی بھر اس نے عیش کروائی وہ اسے تنہا چھوڑ گئے۔ وہ اپنے غرور اور خود غرضی میں سب رشتے کھو بیٹھا اور خدا نے بھی خوب انصاف کیا اس کے بچے کو اٹھا کر زندگی کا ایک اور رخ دکھایا وہ تڑپتا ہوا مر رہا تھا کہ اذان کی آواز آئی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا! وہ اٹھا اور اس آواز کی تلاش کرتا ہوا مسجد کی دہلیز پر جا پہنچا، برسوں بعد اس نے مسجد میں پیر رکھا تھا۔ ادھر تھوڑی دیر بعد جمعہ کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا۔ مولوی صاحب خدا سے معافی طلب کرنے کی تلقین رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ خدا بہت رحیم ہے۔ وہ وضو کرنے اٹھا اور پھر نماز ادا کی۔ وہ شام تک خدا سے معافی مانگتا رہا اور اس نے اپنی زندگی بدل لی۔ خدا کو اس نے بہت قریب پایا اور باقی کی زندگی معافی طلب کرتے ہوئے سکون سے گزارنے لگا۔

تبسم العلوم: 125 روپے کی کتب

رانا عبدالعلیم، کلورکوٹ

پتنگ بازی

ارباز کی عمر 15 سال تھی اور وہ دہم جماعت کا طالب علم تھا بسنت کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ہر روز فضا میں رنگ برنگی پتنگیں اڑتی دیکھ کر اس کا دل بھی پتنگ اڑانے کو چاہتا، مگر اس کے ساتھ ساتھ اسکولوں میں پتنگ بازی کے نقصانات بتا کر اسٹوڈنٹس کو پتنگ بازی سے دور رکھنے کی کوشش بھی جاری تھی۔ ایک روز ارباز اسکول سے گھر آیا تو ٹیلی ویژن پر خبروں میں پتنگ بازی کے باعث ہونے والے جانی اور مالی نقصان کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ کوئی پتنگ کے چکر میں چھت سے گر کر اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھا تھا تو کہیں پتنگ کی ڈور بجلی کی تاروں میں الجھ کر تاروں کے آپس میں ملنے کی وجہ سے حادثہ رونما ہوا۔ ارباز ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھا خبریں سن رہا تھا، اسی دوران گھر کے دروازے پر دستک ہوئی وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ باہر ارباز کا دوست رحیم کھڑا تھا۔ رحیم ارباز کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت کھیلنے کودنے میں صرف کرتا تھا۔ رحیم بسنت کے مہینے میں بڑے جوش و خروش سے پتنگ بھی اڑاتا اور محلے کے دوسرے لڑکوں کو بھی اس خطرناک کھیل میں کسی نہ کسی طرح شامل کر لیتا۔ محلے کے تمام لڑکے بسنت کا اہتمام کرتے اور پتنگ بازی میں مقابلہ بھی کرتے لیکن خوش قسمتی سے ان کے محلے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا جس میں کسی کا کوئی نقصان وغیرہ ہوا ہو۔ تو یوں یہ لڑکے بے دھڑک پتنگ اڑاتے اور کسی کی بات پر کان نہ دھرتے تھے۔ یہاں تک کہ چند شریف اور سدھرے ہوئے لڑکے بھی پتنگ بازی میں حصہ لیتے۔ رحیم کو پتنگ بازی میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ارباز نے رحیم کو دیکھ کر سلام کیا۔ رحیم نے کہا۔ ”یار تم اب زیادہ تر گھر میں ہی رہتے ہو، کیا ہو گیا؟ کبھی گھر سے باہر بھی نکل لیا کرو۔ آج چار دن بعد تمہاری صورت دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔“

”بس یار آج کل پڑھائی میں مصروف رہتا ہوں وقت ہی نہیں ملتا۔“ ارباز نے جواب دیا۔ رحیم نے حیرانگی سے کہا۔ ”کیا تم اس بار پتنگ بھی نہیں اڑاؤ گے؟“

”شاید نہیں، کیوں کہ میرے ابو نے کہا ہے کہ اس بار اگر ماہانہ امتحانات میں کم نمبر حاصل کیے تو بہت پٹائی کریں گے اور دوسرا یہ کہ پتنگ اڑانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ارباز نے افسردہ لہجے میں کہا۔ رحیم دوبارہ گویا ہوا۔ ”تم خود ہی بتاؤ پتنگ اڑانے میں زیادہ سے زیادہ کتنا وقت لگ جاتا ہے۔ رہی بات کسی حادثے کی تو آج تک ہمارے محلے میں ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے۔“ ارباز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ویسے تمہاری بات بھی ٹھیک ہے مگر ...“ ارباز ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ رحیم نے بات کاٹی۔ ”ہم بچے تو ہیں نہیں جو چھت سے گر جائیں گے یا ڈور سے ہمارے ہاتھوں میں زخم آ جائیں گے۔ سال میں ایک بار ہی تو بسنت کا مہینہ آتا ہے اور ہم اس کو یوں ہی ڈرے سہمے گزار دیں اور پتنگ بھی نہ اڑائیں۔“ ارباز کوئی جواب نہ دے پایا۔ رحیم کی باتوں نے وہ تمام نصیحت آمیز باتیں بھلا دیں تھیں۔ یوں وہ رحیم کی باتوں میں آ کر پتنگ اڑانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اب وہ دونوں محلے کے دیگر لڑکوں کے ہمراہ قریبی پارک میں پتنگ اڑانے کے لیے چل دیے۔ وہ سب پتنگ اڑانے میں اس طرح مگن تھے کہ فضا میں اڑتی پتنگیں تھیں اور وہ تھے۔ اچانک ارباز کی پتنگ کی ڈور ٹوٹ گئی ارد گرد کھڑے کچھ لڑکے پتنگ کو

پکڑنے کے لیے دوڑے ارباز بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر بھاگ پڑا اس کی نظریں صرف پتنگ پر تھیں کہ کسی نے کسی طرح وہ اپنی پتنگ واپس حاصل کر لے۔ ایسے میں وہ پارک کی حفاظتی گرل بھی پار کر کے پارک کے ساتھ موجود سڑک پر آ نکلا۔ کار شدت سے ارباز کے ساتھ آ ٹکرائی اور ارباز کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اس کے علاوہ بھی اسے کئی چوٹیں آئیں وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوستو! آپ اندازہ کر سکتے ہیں کے ارباز کے والدین کو یہ خبر سن کر کتنی پریشانی ہوئی ہوگی۔ ہم سب کو بڑوں کی باتوں پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیے۔ ورنہ ہر ایک کا حال ارباز جیسا ہو سکتا ہے۔

چوتھا انعام:115 روپے کی کتب

تعلیم کا مقصد؟؟؟

خدیجہ تحریم، رینالہ خورد

کمرۂ جماعت میں مکمل خاموشی تھی۔ طلباء کی نگاہیں تختہ سیاہ پر جمی ہوئی تھیں جس پر "تعلیم" لکھا نظر آ رہا تھا۔ پروفیسر نعمان کمرے میں یوں چہل قدمی کر رہے تھے جیسے وہ کسی لان کی مخملی گھاس پر چہل رہے ہوں۔ طلباء میں بے چینی کی کیفیت تھی کیوں کہ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پروفیسر انہیں کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ اردو کے مایہ ناز پروفیسر، پروفیسر نعمان انہیں روز اتنے منفرد اور شان دار انداز سے پڑھاتے کہ اردو سے بے زار نظر آنے والے طلباء بھی اب پرذوق نظر آتے ہوئے سفر تعلیم میں اپنے استاد کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے۔ قومی زبان میں طلباء کی دل چسپی بڑھانے والے یہ پروفیسر ہر دل عزیز تھے۔ وہ طلباء کو اتنی محبت اور توجہ سے پڑھاتے کہ کوئی بھی طالب علم ان کا پیریڈ مس نہیں کرتا تھا۔ آج جماعت نہم میں اپنے پیریڈ کے دوران انہوں نے بچوں کو عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے پروفیسر کی خاموشی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ چند ثانیے مزید خاموشی کے بعد پروفیسر صاحب اچانک بولے۔ "علامہ اقبالؒ کو گزرے ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا ہے؟" اس سوال کے ساتھ ہی طلباء اپنی انگلیوں پر سال گننا شروع ہو گئے۔ "سر! اناسی سال ہو گئے ہیں۔" پچھلی نشست سے ایک لڑکے کی آواز آئی۔ "ہوں۔ علامہ اقبال کی وفات کو اناسی سال اور قائداعظم کی وفات کو انہتر سال ہو گئے ہیں۔" وہ رکے اور چند لمحوں کے بعد بولے۔ "بچو! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود کوئی اقبال کیوں نہیں پیدا ہوا؟ قائد سا رہبر کیوں نہیں آیا؟ مرزا غالب، لیاقت علی خان، میر تقی میر، مولانا شبلی نعمانی، شورش کاشمیری جیسے عظیم لوگ کیوں نہیں پیدا ہوئے؟" انہوں نے سوالی نظروں سے طلباء کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے میز سے چاک اٹھایا اور تختہ سیاہ پر کچھ لکھا۔ جب وہ پیچھے ہٹے تو طلباء نے تختہ سیاہ پر واضح الفاظ میں لکھا ہوا دیکھا۔ "تعلیم کا مقصد نوکری؟" وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تو پروفیسر صاحب بولے۔ "کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟" طلباء نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولے۔ "آپ میں سے کتنے بچوں کی تعلیم کا مقصد نوکری نہیں ہے؟" اس پر دو لڑکوں نے اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولے۔ "بچو! آج ہماری تعلیم کا مقصد محض نوکری بن گیا ہے۔ بچپن میں قوم کی خدمت کا عزم کرنے والے بچے جب تعلیم مکمل کر کے جب اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں تو بچپن کا کیا ہوا وعدہ بھلا کر پیسے کمانے میں لگ جاتے ہیں۔ جس قوم میں لوگوں کی تعلیم کا مقصد نوکری ہوگا، اس قوم میں عظیم انسان نہیں بلکہ نوکر پیدا ہوں گے۔" اس بات پر طلباء کے سر جھک گئے۔ شاید وہ اپنی سوچ پر شرمندہ تھے۔ انہوں نے سر نہیں اٹھائے تو پروفیسر صاحب بولے۔ "کیا آپ عظیم انسان کی بجائے نوکر بننا چاہتے ہیں؟" طلباء کے جھکے سر نفی میں ہل گئے۔ کمرے میں خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔ پھر پروفیسر صاحب نے کہا۔ "ٹھیک ہے آپ لوگوں کی خواہشات ہوں گی۔ کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ کوئی انجینئر تو کوئی ٹیچر لیکن آپ یہ مت سوچیں کہ آپ نے پیسے کمانے ہیں کیوں کہ پیسے تو ان پڑھ لوگ بھی کما لیتے ہیں۔ آپ نے اپنی قوم کی خدمت کرنی ہے۔ آپ کو آج ہی اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ آج کی بہتر سوچ کل آپ کی کام یابی کا ذریعہ بنے گی۔ کیا آپ اپنی سوچ بدلنے کے لیے تیار ہیں؟" ان کے پوچھنے پر طلباء یک زبان ہو کر بولے۔ "یس سر!" "شاباش بچو!" انہوں نے خوشی سے کہا۔ "لیکن آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ سوچ آپ خود تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ دوسروں تک بھی پہنچائیں گے۔ میں یہ بات ساری دنیا کو نہیں بتا سکتا لیکن آپ میں سے ایک لڑکا بھی اگر اپنے چند ساتھیوں کو بتائے گا تو خود سوچیں کہ یہ پیغام کتنے لوگوں تک پہنچے گا۔ کیا آپ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائیں گے؟" انہوں نے پوچھا تو طلباء جوش سے بولے۔ "ان شاء اللہ سر!" اور اس نئے عزم پر پروفیسر صاحب خوشی سے مسکرانے لگے۔

پانچواں انعام:95 روپے کی کتب

☆☆☆

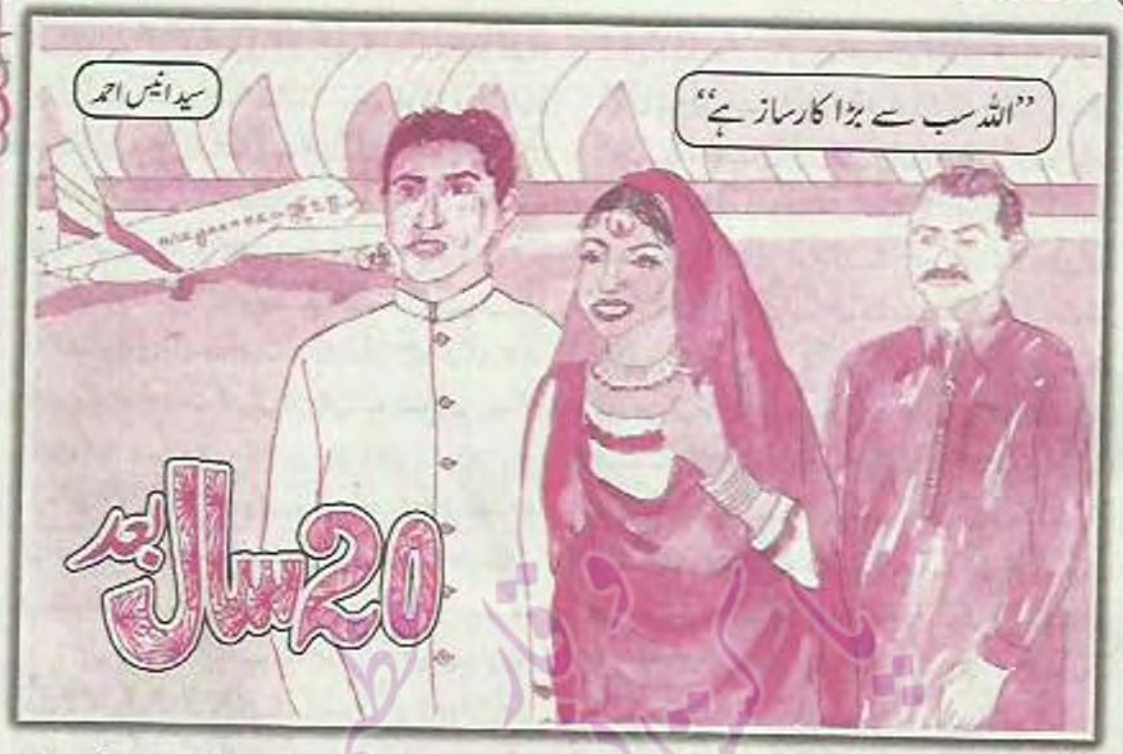

کلاس بھر کی لڑکیاں اپنی ہم جماعت ثمینہ کی کالی رنگت کے بارے میں جلے کٹے انداز میں طرح طرح کے تبصرے کرتی رہتی تھیں اور اس طرح اس کے معصوم دل کو ٹھیس پہنچاتی تھیں۔ ایک لڑکی کہتی: ''اف خدایا کتنا کالا رنگ ہے ثمینہ کا۔'' کوئی دوسری کہتی ''اتنی کالی کلوٹی لڑکی آج تک میں نے نہیں دیکھی۔'' تیسری کہتی۔ ''مجھے تو ثمینہ زہر لگتی ہے زہر۔'' یہ شکیلہ تھی سب سے زیادہ وہی ثمینہ کی کالی رنگت کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ ثمینہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں ایک غریب بیوہ عورت تھی۔ وہ چند کوٹھیوں میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی تھی۔ اس طرح وہ اپنا اور اپنی اکلوتی بچی کا پیٹ پالتی تھی۔ ثمینہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ ثمینہ کم از کم میٹرک تک تعلیم ضرور حاصل کرے۔ وہ ایک غریب عورت تھی اور ثمینہ کو زیادہ پڑھا لکھا نہیں سکتی تھی۔

ثمینہ کی رنگت گہری سانولی تھی۔ اس رنگت کی وجہ سے اس کی کلاس کی کئی ساتھی لڑکیاں اس کا خوب مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ بلکہ کئی لڑکیاں اس سے نفرت کا اظہار بھی کرتی تھیں۔ ثمینہ فطرتاً ایک کم گو اور شرمیلی سی لڑکی تھی۔ کلاس کی ساتھی لڑکیاں اس کی کالی رنگت کے بارے میں جلی کٹی باتیں کرتیں تو وہ بے چاری بس دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ ایک دو بار ثمینہ نے بڑی معصومیت سے اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ امی میرا رنگ اتنا کالا کیوں ہے۔ اس نے ماں کو یہ بھی بتایا تھا کہ کلاس کی کئی لڑکیاں اس کے کالے رنگ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ماں نے ثمینہ کی پیشانی چومی تھی اور پیار بھرے لہجے میں کہا تھا کہ بیٹی تمہارا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ یہ رنگ تم نے خود تو نہیں بنایا۔ یہ سب تو اللہ نے بنایا ہے۔ تمہاری کلاس کی لڑکیوں کو ہدایت دے۔ تم ان کی باتوں کو دل پر نہ لیا کرو بلکہ اپنی توجہ پڑھائی کی طرف رکھا کرو۔

کم گوئی اور شرمیلے پن سے قطع نظر ثمینہ ایک ہمدرد، مخلص اور دوسروں کے کام آنے والی لڑکی بھی تھی۔ ایک روز اس کی ہم جماعت شکیلہ پورے دو دن بعد اسکول آئی تھی۔ وہ بیمار ہو گئی تھی۔ یہ لڑکی سب سے زیادہ ثمینہ کو تنگ کرتی رہتی تھی۔ اب وہ صحت یاب ہو کر اسکول آئی تھی تو پچھلے دو دن کا کام اپنی کاپیوں میں لکھنا چاہتی تھی۔ شکیلہ نے پچھلے دو دن کا کام جس سے بھی مانگا اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ ایسے میں ثمینہ آگے بڑھی۔ اس نے نہ صرف پچھلے دو دن کا کام شکیلہ کو مکمل کرا دیا بلکہ اس کا حال احوال بھی پوچھا۔ شکیلہ ثمینہ کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسے اپنا سلوک یاد آیا جو وہ ثمینہ کے ساتھ کرتی تھی۔ اگلے لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو شرمندگی کے گڑھے میں پایا۔ پھر آنے والے دنوں

میں اس نے کبھی بھی ثمینہ کی کالی رنگت کا مذاق نہ اڑایا بلکہ وہ دوسری لڑکیوں کو بھی ثمینہ کا مذاق اڑانے سے منع کرتی تھیں۔ دوسری لڑکیاں بھلا کہاں باز آنے والی تھیں۔ ان کا ثمینہ کی کالی رنگت کا مذاق اڑانے کا سلسلہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک ثمینہ میٹرک کے بورڈ کا امتحان دے کر فارغ نہ ہوگئی۔

وقت گزرتا رہا۔ آخرکار ثمینہ نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اب ثمینہ اپنی امی سے گھر کے کام کاج کرنا سیکھ رہی تھی۔ تاکہ شادی کے بعد شوہر کے گھر میں کام کاج کے سلسلے میں اسے کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ثمینہ کو میٹرک کا امتحان پاس کیے تقریباً دو برس گزر گئے۔ ثمینہ کی ماں سوچتی تھی کہ جلد از جلد اس کی بیٹی کی شادی ہو جائے تاکہ مرنے سے پہلے اس کا ایک اہم فرض ادا ہو جائے۔

اسکول کی زندگی ختم ہونے کے بعد تو گویا ثمینہ کی جان اپنی ساتھی لڑکیوں کی جلی کٹی باتوں سے چھوٹ گئی تھی جو وہ اکثر ثمینہ کے بارے میں کرتی تھیں لیکن اب ثمینہ کی ماں کی جان عذاب میں آگئی تھی وہ ایسے کہ جس محلے میں ثمینہ اور اس کی ماں عرصہ دراز سے رہ رہی تھیں اس محلے میں چند منہ پھٹ قسم کی عورتیں ایسی بھی تھیں جنہیں جب پتا چلا کہ ثمینہ کی ماں اس کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہی ہے تو ان کی زبانیں زہر اگلنے لگیں۔ ثمینہ کی ماں کو غریب ہونے کے طعنے تو وہ پہلے بھی بتا دیتی تھیں اب وہ ثمینہ کے بارے میں زہر افشانی کر کے اس کی ماں کا دل دکھانے لگیں۔ کوئی کہتی "یہ ثمینہ کی ماں کو کیا سوجھی کہ اپنی بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنے لگی۔ ذرا سوچو تو ذرا اتنی کالی رنگت والی لڑکی سے کون پاگل شادی کرے گا۔" کوئی دوسری عورت کہتی۔ "کوئی بھی نہیں کرے گا اس سے شادی اس کے کالے رنگ کی طرح اس کا نصیب بھی کالا ہے کالا۔" تیسری عورت لب کشائی کرتی۔ "ثمینہ کے لیے کوئی رشتہ مل بھی گیا تو اس کی طرح کالا بھجنگ قسم کا کوئی غریب سا لڑکا ہی ہوگا۔"

ایسی باتیں سن کر ثمینہ کی ماں کا دل خون کے آنسو روتا تھا مگر ان کے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ثمینہ کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا کہ دو تین گھرانوں سے ثمینہ کو دیکھنے کے لیے چند عورتیں ضرور آئیں لیکن پھر مڑ کر نہیں آئیں گویا بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ شاید ثمینہ کی شکل وصورت اور گہری سانولی رنگت نے ان عورتوں کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ سانولی رنگت والی ثمینہ کتنے اچھے اخلاق کی مالک لڑکی ہے۔ کتنی خوبیوں کی مالک ہے۔ ثمینہ کی ماں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا مانگا کرتی تھی۔ "یااللہ میری ثمینہ کا نصیب کھول دے۔ وہ کسی اچھے گھرانے میں بیاہی جائے۔ میں تو اب بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میرے مرنے سے پہلے ثمینہ کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ میں اگر ثمینہ کی شادی ہونے سے پہلے مر گئی تو میری معصوم ثمینہ اس ظالم دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ تو سب سے بڑا کارساز ہے۔ میری بیٹی کے حق میں اچھا کرنا۔" وقت بے بسی کے عالم میں گزرنے لگا لیکن پھر بھی ثمینہ کی ماں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ محلے کی کم ظرف عورتیں اب بھی ثمینہ کی کالی رنگت اور ان کی غربت کے بارے میں تلخ وترش باتیں کر کے ثمینہ کی ماں کا کلیجہ چھلنی کرتی رہتی تھیں۔ ان کی زبانیں رکنے والی نہیں تھیں۔ ان کی باتیں سن سن کر ثمینہ کی ماں کا دل دکھ سے لبالب بھر گیا تھا۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ اللہ سے لگائی ہوئی امید کا دامن بھی رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔ وہ سخت مایوس ہونے لگی تھی کہ ایک رات عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد ثمینہ کی ماں مایوسی کے لبادے سے نکل کر ایک بار پھر اپنی بیٹی کے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کی شادی کے اسباب پیدا کر دے۔ دعا کرتے کرتے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بھی بہہ نکلے تھے۔ یہ اسی رات کی صبح کی بات ہے۔ ثمینہ کی ماں کام پر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ثمینہ کی ماں دروازے کی طرف بڑھی اور پوچھا۔ "کون ہے؟" باہر سے سوالیہ انداز میں پوچھا گیا۔ "زبیدہ بہن کا یہی گھر ہے۔" آواز مردانہ تھی۔ ثمینہ کی ماں کا نام زبیدہ تھا لہٰذا اس نے کہا۔ "میرا نام ہی زبیدہ ہے۔ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا کام ہے۔" ثمینہ کی ماں نے دروازہ کھولے بغیر ہی پوچھا۔ "زبیدہ بہن میں شوکت ہوں تمہارا سگا بھائی۔" باہر سے وہی مردانہ آواز آئی۔ "اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولو گی اپنے بھائی کے لیے۔" "شوکت" ثمینہ کی ماں لڑکھڑا کر بولی پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ادھیڑ عمر کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے

چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی اور وہ عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ ثمینہ کی ماں اپنے اکلوتے بھائی شوکت کو پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔ چند ساعتوں تک تو وہ اسے دیکھتی رہی پھر آخرکار بولی۔ ”اتنے سالوں بعد بہن کی یاد آ ہی گئی تمہیں شوکت۔ آؤ آؤ اندر آ جاؤ۔“ وہ دونوں بہن بھائی اندر والے کمرے میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ثمینہ کی ماں بولی۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ تم اپنی غموں کی ماری بہن کو بھول چکے ہو گے۔“ شوکت بولا۔ ”اگر میں آپ کو بھول چکا ہوتا زبیدہ بہن تو شاید کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں زبیدہ بہن کہ میں نے اتنے لمبے عرصے تک آپ سے تعلق توڑے رکھا۔“ تم تو اپنے بیوی بچوں سمیت سالوں پہلے کسی باہر کے ملک چلے گئے تھے۔ اب کیسے ہیں اور کہاں ہیں تمہارے بیوی بچے۔“ ثمینہ کی ماں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”وہ سب ٹھیک ہیں اور دوبئی میں رہتے ہیں۔ اب تو دوبئی میں میرا ذاتی کاروبار بھی ہے۔ پورے بیس سال میں نے وہاں سخت محنت کی ہے۔“ شوکت نے بتایا۔ ”اور ان بیس برسوں میں میں نے یہاں کتنے غم اٹھائے ہیں تمہیں کیا معلوم۔“ ثمینہ کی ماں نے دکھ بھرے لہجے میں گویا شکوہ کیا۔ ”دیر سے ہی سہی میں آپ سے ملنے آ ہی گیا ہوں زبیدہ بہن۔ اتنا لمبا عرصہ میں آپ کی طرف سے بالکل بے خبر رہا ہو سکے تو اس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔“ شوکت نے شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔ اتنے میں ثمینہ نے کمرے سے جھانکتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھا۔ ”امی گھر میں کون آیا ہے؟“ ”بیٹی اندر آ جاؤ یہ تمہارے ماموں شوکت ہیں۔“ ماں نے کہا ثمینہ کمرے میں آ گئی اور حیران نظروں سے اپنے ماموں شوکت کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”امی یہ وہی شوکت ماموں ہیں جن کا ذکر آپ کبھی کبھار کرتی تھیں۔“ ”ہاں یہ تمہارے وہی شوکت ماموں ہیں۔ پورے بیس سال بعد آئے ہیں۔“ ثمینہ کی ماں نے بتایا۔ ”السلام علیکم ماموں جان۔“ ثمینہ نے سلام کیا۔ شوکت ماموں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے دعا دی۔ ”جاؤ بیٹی اپنے ماموں کے لیے چائے وغیرہ بنا لاؤ۔“ ”جی اچھا! امی جان۔“ ثمینہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی۔ پھر دونوں بہن بھائی باتوں میں مگن ہو گئے۔ باتوں باتوں میں شوکت کو پتا چلا کہ اس کی بہن زبیدہ نے کتنی دکھ بھری زندگی گزاری ہے۔ اب اس کی اکلوتی بیٹی ثمینہ جوان ہو چکی ہے۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کی زندگی کا ایک اہم فرض ادا ہو جائے لیکن افسوس ایک تو غربت اور اوپر سے ثمینہ کی کالی سیاہ رنگت کی وجہ سے اس کا رشتہ کہیں بھی طے نہیں پا رہا۔ اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے ثمینہ کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شوکت کا دل بھر آیا۔ اس نے بغیر کسی پس وپیش کے ثمینہ کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ پیش کر دیا جو دوبئی میں کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ثمینہ کے ماموں ثمینہ کے ظاہری رنگ و روپ کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔ وہ اس کی بہن کی بیٹی تھی۔ شوکت نے تو اپنے بیٹے کا رشتہ پیش کر کے بس خون کے رشتوں کا بھرم رکھا تھا۔ ثمینہ کی ماں روہانسی ہو کر شکر گزار نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے بھائی نے اس کا دکھ بانٹ لیا ہو۔ اس نے ثمینہ کے لیے اپنے بھائی کے بیٹے کے رشتے کو فوراً قبول کر لیا۔

شوکت کا اپنی بہن کے ساتھ جو تعلق حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ بیس سال بعد واپس آ کر اس نے نہ صرف اس تعلق کو جوڑا تھا بلکہ اس کی بیٹی کے ساتھ اپنے بیٹے کا رشتہ طے کر کے اس تعلق کو مزید مضبوط کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا فرماں بردار تھا۔ باپ کی رضا میں راضی رہتا تھا۔ تقریباً ہفتہ بھر شوکت اپنی بہن کے یہاں رہے۔ اس دوران اسے اور ثمینہ کو ایک گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ثمینہ کی ماں انہیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ثمینہ کی ماں کی تجہیز و تکفین کے بعد اس کے ماموں شوکت اسے اپنے ساتھ دوبئی لے گئے تھے۔ جہاں ایک نئی زندگی اس کی منتظر تھی۔ اس کی محلے دار عورتیں اس کے بارے میں محض جلی کٹی باتیں ہی کرتی رہ گئی تھیں اور ثمینہ نے دوسرے ملک جا کر شادی شدہ زندگی کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ اس کی محلے دار کم عقل عورتیں شاید یہ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اللہ سب سے بڑا کارساز ہے۔ وہ چاہے تو وہ کام بھی پورا ہو جاتا ہے جس کام کا پورا ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ ☆☆☆

ہنسیے

نوازش: ”ایک دفعہ میرے ابا نے ایک ہاتھ سے ریل روک لی تھی۔“

عشرت: ”سچ! پھر تو وہ بڑے طاقت ور ہیں۔“

نوازش: ”مگر انہوں نے زنجیر کھینچی تھی۔“

ہندسے کس نے ایجاد کیے؟

ہندسے یا عدد (Numbers) کی ایجاد سے پہلے انسان انگلیوں پر حساب کتاب کرتا تھا (اب بھی ان پڑھ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں)۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے مصریوں نے تصویری خط ایجاد کیا تو انہوں نے مختلف ہندسوں کے لیے مختلف تصویریں مقرر کیں۔ مثلاً وہ کاغذ پر ری کے لچھے کی تصویر بناتے تو اس کا مطلب ہوتا 100۔ ایک کنول کے پھول کے معنی تھے 1,000 اور مینڈک کا مطلب تھا 100,000۔ اس طرح وہ کام تو چلا لیتے تھے لیکن جمع، تفریق، تقسیم کرتے وقت بہت مشکل پیش آتی تھی۔ ذرا آپ تین کنول کے پھولوں کو دو مینڈکوں میں سے تفریق کر کے دیکھیے!

تقریباً اسی زمانے میں یونان کے لوگ ہندسوں کے لیے یونانی زبان کے حروف استعمال کرتے تھے اور روم کے باشندے بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کے ایک سے دس تک ہندسے اس طرح تھے: I II III IV V VI VII VIII IX X۔ رومن ہندسوں کی یہ علامتیں اب صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے ہندو ریاضی کے موجد ہیں اور یہ ہندسے جو اب ساری دنیا استعمال کرتی ہے، انہی کی ایجاد ہیں۔ آج سے تقریباً 1,200 سال پہلے عربوں نے یہ ہندسے ہندوؤں سے سیکھے اور جب 711ء میں انہوں نے (یورپ کا ایک ملک) اسپین فتح کیا اور وہاں یونی ورسٹیاں اور کالج قائم کیے تو یورپ کے لوگوں نے ان سے دوسرے علوم کے ساتھ ریاضی کی تعلیم بھی حاصل کی اور اس طرح ان ہندسوں کا تمام یورپ میں رواج ہو گیا۔ چوں کہ یورپ والوں نے یہ ہندسے عربوں سے سیکھے تھے، اس لیے وہ انہیں عربی ہندسے (Arabic Numerals) کہتے تھے (اور اب بھی کہتے ہیں۔)

ریاضی میں صفر یا زیرو (0) بھی ہندوؤں ہی کی ایجاد ہے۔ وہ اسے ''شونیہ'' کہتے ہیں۔ (شونیہ کا مطلب ہے ''خالی۔'') عربوں نے اسے صفر کا نام دیا اور یورپ کے لوگوں نے اسے بگاڑ کر سائفر (Cipher) کر دیا۔ صفر کی ایجاد سے حساب کتاب میں بہت آسانی ہو گئی اور لوگ لاکھوں، کروڑوں، اربوں اور کھربوں تک گننے لگے۔

یہ صفر بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اسے کسی ہندسے کے بائیں طرف لگا دیں (مثلاً 02) تو اس کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔ لیکن اسے ہندسے کے دائیں طرف لگا دیں تو اس کی قیمت 10 گنا بڑھ جائے گی (مثلاً 20)۔ اور اگر اس کے آگے صفر لگاتے جائیں تو آپ ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، ارب، دس ارب، کھرب، دس کھرب تک گن سکتے ہیں۔

نیچے ہندی، عربی اور یورپی ہندسے دیے گئے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہو گا کہ عربوں اور یورپ کے لوگوں نے، اپنی سہولت کے لیے، ان میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں:

ہندی: ٩ ٨ ٧ ٦ ٥ ٤ ٣ ٢ ١

عربی: ٩ ٨ ٧ ٦ ٥ ٤ ٣ ٢ ١

یورپی: 9 8 7 6 5 4 3 2 1

اردو میں عربی ہندسے ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ صرف چار اور سات کے ہندسوں کو تبدیل کیا گیا ہے۔ اردو میں ان ہندسوں کی شکل اس طرح ہے: ۴۔ ۷۔

☆☆☆

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

جناب ایڈیٹر صاحب! پشاور میں تعلیم و تربیت بہت لیٹ مل رہا ہے۔ مہربانی فرما کر کچھ کریں۔ میرے دادا ابو کہتے ہیں کہ ان کے ابو بھی ان کو تعلیم و تربیت لا کر دیتے تھے اور میرے دادا ابو میرے ابو کو بھی صرف تعلیم و تربیت لے کر دیتے تھے اور اب وہ میرے لیے تعلیم و تربیت لا کر دیتے ہیں مجھے یہ رسالہ اچھا لگتا ہے اور میری اردو بھی اچھی ہو گئی ہے۔ (حیاء زاہرا، پشاور)

محترمہ ایڈیٹر صاحب! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے تقریباً چار سال ہو گئے ہیں لیکن یہ میرا دوسرا خط ہے۔ پہلے خط لکھا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ امید ہے اس بار خط ضرور شائع ہو گا۔ اب آتے ہیں تعلیم و تربیت کی طرف۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ تعلیم و تربیت کی ساری کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ حمد اور نعت پڑھ کر دل کو تازگی ملتی ہے۔ کھوج لگائیے بہت زبردست سلسلہ ہے۔ آیئے مسکرایئے پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ محاورہ کہانی بہت مزے کی ہوتی ہے۔ ناول ''ویران جزیرے کا راز'' بہت دل چسپ ہے۔ مجھے ہر مہینے تعلیم و تربیت کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین!)

(الفت بتول، سیال کوٹ)

☆ ڈیئر الفت، بہت عرصے کے بعد آپ ہماری محفل میں آئی ہیں۔ خیریت رہی.....؟

نئے سال کا پہلا شمارہ ملا۔ حسب معمول بہت ہی مفید اور خوب صورت ہے۔ سب سلسلے اچھے ہیں مگر ''ویران جزیرے کا راز'' بالکل پسند نہیں ہے۔ یہ ایک بور کہانی ہے۔ اسے فوراً بند کر دیں۔ دماغ لڑاؤ کا پرانا سلسلہ بھی بحال کر دیں۔ جس میں 10 فقروں کی خالی جگہیں اسی شمارے کی مدد سے پُر کرنی ہوتی ہیں۔ اس سے بچوں میں پورا رسالہ پڑھنے کی عادت پختہ ہو جائے گی اور ذہانت میں بھی اضافہ ہو گا۔ آخر میں یہ تجویز پیش خدمت ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک نظر سے دیکھا کریں۔ ہر جگہ لڑکیوں ہی کو مقدم رکھنا ہو تو پھر لڑکوں کے لیے الگ سے ایک رسالہ نکالیں۔ (راج ولی خان، نوشہرہ)

ڈیئر آپی جان! 2018ء کا پہلا شمارہ زبردست ترین تھا۔ میں کافی دیر بعد شرکت کر رہی ہوں پتا نہیں آپ کو میں یاد ہوں بھی کہ نہیں خیر پر اب میں واپس آ گئی ہوں۔ اب آپ کو یاد آ جاؤں گی اور رہی بات ''تعلیم و تربیت'' کی تو کیا کہنے ہیں اس کے واقعی بڑا زبردست ہے۔ کہانی ''نئے سال کا استقبال'' بہت ہی اچھی تھی۔ ''جاڑا آیا'' نے سردیوں کے فوائد بتائے۔ واقعی سردیاں بھی نعمت ہیں۔ کوئی بھی چیز مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی جاتی۔ واقعی بہت ہی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ پلیز اس ناول کے بعد ''محترم اشتیاق احمد کی ''جمشید سیریز'' کا کوئی ناول شائع کریں۔ میں یہ گزارش گزشتہ خطوط میں دو سے تین بار کر چکی ہوں۔ برائے مہربانی میرے خط کو شائع کرنا اگر آپ مناسب نہ سمجھیں تو کم از کم جواب دے دیں۔

آخر میں پھر ایک بار تعلیم و تربیت کی تعریف کے دو میٹھے بول:

جس کو طوفان سے الجھنے کی عادت ہو محسن
ایسی کشتی کو سمندر بھی دعا دیتا ہے

یا پھر کچھ اس طرح ''ایسے رسالے کو قاری بھی دعا دیتا ہے۔'' خدا حافظ۔

(مومنہ عامر غازی، لاہور)

☆ پیاری سی مومنہ خوش آمدید۔ ہم تو آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر غور کریں گے۔

آپی امید ہے آپ اور آپ کی ٹیم خیریت سے ہوں گے اور اگلے شمارے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ سب سے پہلا رسالہ جو ہاتھ لگا اور ذوق مطالعہ کا سبب بنا وہ یہی پیارا مجلہ ''تعلیم و تربیت'' تھا۔ روز افزوں مطالعے میں اضافہ ہوتا رہا اور پھر ہم نے اخبارات (ہفتہ وار کڈز میگزین) میں کہانیاں لکھ کر اپنی صلاحیتوں کی جانچ پڑتال کی۔ ایک دن خیال آیا کہ اپنے محبوب رسالے میں بھی مقدر آزمائی ہونی چاہیے۔ اللہ پاک کا بے حد احسان کہ

ہماری کہانی دوسرے نمبر پر آئی۔ حوصلہ ملا اور پھر لکھنے کے باقاعدہ عمل کا آغاز ہوگیا۔ کئی خط آپ کو ارسال کیے شائع نہ ہو سکے۔ ہم خاموش ہو گئے لیکن جب جنوری 2018ء کا شمارہ پڑھتے پڑھتے نظر جب ''جناب سعید لخت'' پہ لکھے گئے مضمون پر گئی تو سچ پوچھیے دل کتنا خوش ہوا۔ بے ساختہ آپ کو آپ کی اس قابل تعریف کوشش پر سراہنے کو جی چاہا۔ بچوں کے مصنفین میں سعید لخت میرے بہترین مصنف تھے۔ ان کی کہانیاں ہمیشہ پُرلطف ہوا کرتی تھیں۔ ان کے اور ان کی خالہ زاد سیما کے بارے پڑھ کر ہم کھل کھلا اٹھتے تھے۔ ان کو دیکھنے کی خواہش پر گوگل سرچ کیا تو وہ ادھیڑ عمر تھے۔ ہم انگلیاں منہ میں دبائے ان کو یک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کا لکھنے کا انداز واقعی قابل ستائش ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک عرصے تک ہمارے رسالے کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں تو بے جا خوشی ہوئی۔ آپی! آپ ان کی کہانیاں متواتر سے شائع کرتے رہا کریں۔ بچی بڑے ہو کر بھی جی چاہتا ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھیں۔ ماشاء اللہ اس دفعہ تو کافی عرصے بعد علی اکمل کی بھی انٹری ہوئی۔ وہ بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ رسالہ ہر بار کی طرح اس بار بھی سپرہٹ تھا۔ اگلے ماہ یعنی فروری میں میری سال گرہ بھی ہے۔ پلیز آپی! مایوس نہ کیجیے گا۔ آپ بچوں کے ادب کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں اللہ پاک آپ کو اس کا اجر عظیم دیں۔ آمین۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ فی امان اللہ۔

(زیب النساء، گوجرانوالہ)

☆ سال گرہ کی مبارک باد قبول کریں۔

ایڈیٹر صاحبہ، آپ کا کیا حال ہے؟ حسب معمول اس بار بھی جب میں نے رسالہ تعلیم و تربیت کھولا اور دیکھا کہ اس کے اندر حسین تحریروں کے ساتھ میری تصویر ہونہار مصور میں چھپی ہے، جس میں مجھے چوتھا انعام ملا ہے۔ پھر کچھ رسالے کو غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ اس میں تو میری اپنی بھی تصویر چھپی ہے میری زندگی کے مقاصد میں اور خط بھی چھپا ہے۔ یہ سب دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور انعام کا انتظار کرنے لگا۔ اتنی بے صبری اور مسلسل انتظار کے بعد اگلے دن ہی انعام میرے گھر کے دروازے پر تھا۔ پھر میں نے کتاب کھولی تو مجھے لگا کہ یہ بہت دل چسپ ہے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج ہی پوری کتاب چٹ کر جاؤں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب چلتے ہیں تعلیم و تربیت کی تعریف کی طرف۔ جنوری کا شمارہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی بہت دل چسپ تھا۔ نئے سال کا استقبال، تحفۂ رسول نماز، جاڑا آیا اور باقی سلسلے بہت سبق آموز اور دل چسپ تھے۔ خاص طور پر بلاعنوان میں کچھ سلسلوں میں حصہ لے رہا ہوں۔ امید ہے کہ انعام حاصل کر لوں گا۔ ان شاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی سے نوازے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر کرتا جائے۔ (آمین) اب اجازت چاہوں گا۔ ایک شعر کے ساتھ:

چمکتا چہکتا تعلیم و تربیت میرے گھر آیا
ساتھ میں حسین تحریروں کا گل دستہ لایا

(محمد ابراہیم، اسلام آباد)

پیاری آپی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔ میں دو مہینوں سے خط بھیج رہی ہوں لیکن آپ شائع ہی نہیں کرتیں ہمیشہ میرا خط ردی آپا کا نوالہ بنتا ہے۔ اگر بات کی جائے جنوری کے شمارے کی تو ہر کہانی ہی زبردست تھی۔ کہانی آپ زم زم پڑھ کر تو ڈرلگ رہا تھا۔ امید ہے کہ میرا یہ خط فروری کے تعلیم و تربیت کا حصہ بنے گا۔ میری لکھائی کیسی ہے؟

(کہکشاں ادریس)

☆ پیاری کہکشاں! لکھائی کو مزید بہتری کی ضرورت ہے۔ کوشش جاری رکھیے۔ اپنی تحاویز اور کہانیاں بھی بھیجیں۔ ——☆——

عزیز قارئین! رسالے اور اپنے خطوط کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں 042-36278816

جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں:

شازیہ ہاشم میواتی، کھڈیاں خاص۔ ایمان فاطمہ، جام پور۔ حسن مختار، میرپور آزاد کشمیر۔ سیدہ جویریہ شوکت، اوکاڑہ۔ غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ روا نور، فیصل آباد۔ محمد سالار، گوجر خان۔ عدن سجاد، جھنگ۔ میمونہ نوید، راول پنڈی۔ محمد شماس حسین، بہاول پور۔ محمد سعد سیف، لاہور۔ ظفر محمود اعظم، راجہ جنگ، قصور۔ حسن رضا سردار وصلی، خدیجہ نشان، محمد صفدان قادری، محمد اسد عبداللہ قادری، زردہ ایوب، یاسین مولا بخش، لاہور۔ سہیل اختر، ایبٹ آباد۔ عذرا افضل، اسلم وہاب، اوکاڑہ۔ ارباب، ایبٹ آباد۔ نوید اقبال، جاوید اقبال، کراچی۔ سبحان زاہد، ارشد زاہد، راول پنڈی۔ مدیحہ اقبال، زوبیا اشفاق، رضیہ اسلم، عرشیہ افضال، سیال کوٹ۔ تبسم رضا، لاہور۔ عزیرین احمد، کراچی۔ زہرہ فضل، پشاور۔ وقاص فرید قریشی، ملتان۔ عدنان ملک، ماہم آصف، لاہور۔

لال ٹوپی والی

ایک تھا جنگل۔ جنگل کے پاس ایک گاؤں تھا۔ گاؤں میں ایک عورت رہتی تھی۔ عورت کی ایک ننھی سی بچی تھی۔ وہ لال ٹوپی اوڑھتی تھی۔ گاؤں والے اسے لال ٹوپی والی کہتے تھے۔

جنگل کے دوسرے کنارے پر، ایک اور گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں لال ٹوپی والی کی نانی رہتی تھی۔

ایک دن صبح سویرے ماں نے اپنی بیٹی کو اچھے اچھے کپڑے پہنائے، سر پر لال ٹوپی اوڑھائی اور بولی: ''یہ ٹوکری لو۔ اس میں حلوا ہے اور شربت کی ایک بوتل۔ لپک جھپک جاؤ اور اپنی نانی کو دے آؤ۔''

''بہت اچھا، امی۔'' ننھی بچی نے کہا۔

ماں بولی ''اور ہاں، گرمی کے دن ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سورج سر پر آ جائے گا۔ سیدھی جانا۔ راستے میں کہیں نہ رکنا۔ نہ کسی اجنبی سے بات کرنا۔''

''سیدھی جاؤں گی۔ کہیں نہیں رکوں گی۔ کسی سے بات نہیں کروں گی۔'' بچی نے کہا۔

ماں بولی۔ ''نانی کو میرا سلام کہنا اور کہنا، کسی دن میں بھی آؤں گی۔''

لڑکی نے ٹوکری اٹھائی اور نانی کے گھر کی طرف چل دی۔ نانی کے گاؤں کو، جنگل میں سے راستہ جاتا تھا۔ وہ جنگل میں داخل ہوئی تو حلوے کی خوش بو پا کر جنگلی جانور اپنے اپنے بلوں اور گھونسلوں سے نکل آئے۔

چڑیا بولی۔ ''اے ننھی، تھوڑا سا حلوا ہمیں بھی دو۔''

خرگوش بولا۔ ''میں تو شربت پیوں گا۔ بہت دنوں سے نہیں پیا ہے۔''

لال ٹوپی والی بہت اچھی، بہت نیک، بہت رحم دل لڑکی تھی۔ اگر یہ چیزیں اس کی ہوتیں تو وہ انہیں جانوروں میں بانٹ دیتی۔ لیکن یہ تو اس کی نانی کی تھیں۔ وہ کسی دوسرے کو کیسے دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا: ''دیکھو بھئی، یہ چیزیں میں نانی کے لیے لے جا رہی ہوں۔ امی نے کہا ہے، نانی کے سوا کسی کو نہ دینا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں نہیں دے سکتی۔ ہاں، اگلی دفعہ آؤں گی تو تمہارے لیے بھی لاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک بھیڑیا آ گیا۔ چڑیا پھر سے اڑ کر درخت پر جا بیٹھی۔ خرگوش بل میں گھس گیا۔ لال ٹوپی والی بہت بہادر لڑکی تھی۔ وہ بھیڑیے سے نہیں ڈری۔ بھیڑیے نے

کہا: ''سلام، ننھی ٹن ٹن۔ یہ صبح ہی صبح کہاں چلیں؟''

''نانی اماں کے گھر۔ ان کے لیے حلوا اور شربت لے جا رہی ہوں۔'' ننھی نے جواب دیا۔

''اور میری پیاری بچی، تمہاری نانی اماں رہتی کہاں ہیں؟'' مکار بھیڑیے نے پوچھا۔

''یہاں سے ایک میل دور جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، وہاں ایک گاؤں ہے۔ نانی اماں وہیں رہتی ہیں۔ ان کے دروازے کا رنگ لال ہے اور اس کے پاس اونچا سا درخت کھڑا ہے۔''

لال ٹوپی والی کو دیکھ کر بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اس کی تکا بوٹی کر دے لیکن پھر سوچا کہ اس بچی سے میرا کیا بنے گا۔ اس کے ساتھ اس کی نانی کو بھی کھاؤں گا، تب میرا پیٹ بھرے گا۔ اس نے کہا:

''تم تو ایسے جا رہی ہو جیسے کوئی اسکول جاتا ہے۔ وہ دیکھو، سامنے رنگ برنگ پھول کھلے ہیں۔ تمہاری نانی یہ پھول پا کر بہت خوش ہوں گی۔''

لال ٹوپی والی نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہاں لال، پیلے، نیلے پھول ہوا میں جھوم رہے تھے۔ اس نے سوچا، میں ان پھولوں کا گل دستہ نانی اماں کو دوں گی تو سچ مچ انہیں بہت خوشی ہو گی۔ ابھی تو صبح ہی ہے۔ دوپہر سے پہلے پہلے نانی اماں کے گھر پہنچ جاؤں گی۔''

اس نے ٹوکری نیچے رکھی اور پھول چننے لگی۔

اب بھیڑیے کی سنیے۔ وہ بھاگم بھاگ نانی کے گھر پہنچا اور دروازہ کھٹ کھٹایا: کھٹ کھٹ کھٹ۔

''کون ہے؟'' نانی نے اندر سے پوچھا۔

بھیڑیا باریک آواز میں بولا۔ ''میں ہوں آپ کی نواسی، لال ٹوپی والی۔ آپ کے لیے حلوا اور شربت لائی ہوں۔ مہربانی کر کے دروازہ کھولیے۔''

''دروازہ کھلا ہے، میری بچی۔ اندر آ جاؤ۔'' نانی نے کہا۔

بھیڑیے نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ نانی اماں اسے دیکھ کر ڈر گئیں۔ انہوں نے بستر پر سے چھلانگ لگائی اور الماری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

بھیڑیے نے سوچا، پہلے لڑکی کو کھاؤں اور پھر بڑھیا کو کھاؤں گا۔ یہ بچ کر جائے گی کہاں۔ وہ نانی کے پلنگ پر لیٹ گیا اور لال ٹوپی والی کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر لال ٹوپی والی نے گل دستہ بنا لیا تھا اور اب، ٹوکری اٹھائے، نانی کے گھر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے گھر کے

دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی: کھٹ کھٹ کھٹ۔

بھیڑیے نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

لال ٹوپی والی اس کی آواز سن کر حیران ہوئی۔ پھر سوچا، شاید زکام کی وجہ سے نانی اماں کی آواز بھاری ہوگئی ہے۔ اس نے کہا:

''میں ہوں، آپ کی نواسی۔ لال ٹوپی والی۔ آپ کے لیے حلوا اور شربت لائی ہوں اور ہاں، پھولوں کا گل دستہ بھی۔ یہ پھول میں نے آپ کے لیے جنگل میں چنے تھے۔ مہربانی کر کے دروازہ کھولیے۔''

بھیڑیے کی، خوشی سے، باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کہا۔

''دروازہ کھلا ہے، میری بچی۔ اندر آ جاؤ۔''

لال ٹوپی والی نے دروازہ کھولا۔ اندر آئی۔ بھیڑیے نے اپنا جسم چادر میں چھپا لیا۔ اس کا تھوڑا سا منہ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس نے کہا:

''ٹوکری میز پر رکھ دو، اور میرے پاس آؤ کہ تمہیں پیار کروں۔''

لال ٹوپی والی، آہستہ آہستہ، پلنگ کی طرف بڑھی، لیکن پھر ایک دم رک گئی۔ بولی۔ ''نانی اماں، آپ کے کان اتنے بڑے کیوں ہیں؟''

''تاکہ تمہاری پیاری پیاری باتیں اچھی طرح سن سکوں۔''

بھیڑیا بولا۔

''اور آپ کی آنکھیں اتنی بڑی کیوں ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''تاکہ تمہاری پیاری پیاری صورت اچھی طرح دیکھ سکوں۔'' بھیڑیے نے جواب دیا۔

''اور آپ کے دانت اتنے بڑے کیوں ہیں؟''

''تاکہ تمہیں اچھی طرح چبا کر کھا سکوں۔''

یہ کہہ کر بھیڑیے نے بستر سے چھلانگ لگائی اور منہ پھاڑ کر لڑکی کی طرف بڑھا۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ کہانی ختم ہوگئی۔ بھیڑیا لال ٹوپی والی کو کھا گیا۔ لیکن نہیں۔ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ آپ شاید ان جانوروں کو بھول گئے جو اس بچی کو جنگل میں ملے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ بھیڑیے کی نیت اچھی نہیں۔ وہ لڑکی اور اس کی نانی، دونوں کو کھانا چاہتا ہے۔ چڑیا نے چوں چوں کر کے لڑکی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ بھیڑیے سے خبردار رہے۔ لیکن وہ باتوں میں ایسی مگن تھی کہ چڑیا کی چوں چوں نہیں سنی۔

چڑیا، تیزی سے اڑتی ہوئی، جنگل کے رکھوالے کے پاس گئی اور اسے ساری بات بتائی۔ وہ بندوق لے کر اسی وقت چڑیا کے ساتھ ہولیا۔

اور عین اس وقت جب بھیڑیا لال ٹوپی والی طرف بڑھ رہا تھا، کھٹاک سے دروازہ کھلا اور جنگل کا رکھوالا، بندوق تانے، اندر داخل ہوا۔ پھر ٹھاہ کی آواز آئی اور بھیڑیا زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔

نانی اماں الماری کے اندر بند تھیں۔ انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ بے چاری کچھ اونچا بھی سنتی تھیں۔ لال ٹوپی والی نے زور زور سے الماری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور چیخ چیخ کر آوازیں دیں تو باہر نکلیں اور دوڑ کر نواسی کو گلے سے لگا لیا۔

نانی اور نواسی نے جنگل کے رکھوالے کا شکریہ ادا کیا اور چائے پانی سے اس کی خاطر کی۔ لال ٹوپی والی کچھ دیر نانی کے ساتھ رہی اور پھر اپنے گھر واپس آ گئی۔ اس نے ماں کو ساری بات بتائی اور وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی راستے میں نہیں رکے گی، اور نہ کسی اجنبی سے بات کرے گی۔ ☆☆☆

محمد خلیل چودھری

جہلم Jhelum شہر صوبہ پنجاب کا ایک تاریخی شہر جو عین جرنیلی سڑک پر دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر گجرات سے 53 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جہلم کے نام کے بارے میں مؤرخین کی مختلف آرا ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جہلم کا نام پہلے جلہم تھا۔ جل کا مطلب پانی اور ہم کا مطلب ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔ جہلم سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ جب اسکندر اعظم اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا دریائے جہلم کے کنارے واقع ایک مقام پر پہنچا تو اس نے اپنا پرچم وہاں نصب کر دیا اور اسے ''جائے علم'' یعنی پرچم کی جگہ قرار دیا۔ یہ لفظ کثرت استعمال سے جہلم ہو گیا۔

عہد مغلیہ سے ماقبل دریائے جہلم کے غربی کنارہ پر لب شاہ راہ (Highway) ایک گاؤں آباد تھا۔ جس کو جہلم کہا جاتا تھا۔ وہ اب تک موجود ہے اور پرانی جہلم کے نام سے مشہور ہے۔ 1532ء کے قریب چند ملاح کشتی رانی کی سہولت کے لیے دریا کے دائیں کنارے پر آ کر آباد ہوئے اور موجودہ شہر کی بنیاد ڈالی۔ 24 مارچ 1849ء کو برطانوی حکومت جہلم شہر پر قابض ہوئی اس وقت یہ قصبہ صرف پانچ سو (500) مکانات پر مشتمل تھا۔ اکثر آبادی ملاح اور تجارت پیشہ تھی۔ دریا کے کنارے کی وجہ سے انگریزی چھاؤنی قائم کی گئی۔ 1867ء میں یہاں میونسپلٹی قائم کی گئی۔ بعدازاں ریلوے اسٹیشن بھی قائم ہوا اور دریائے جہلم سے نہریں بھی نکالی گئیں۔ اب یہ ضلعی صدر مقام اور فوجی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انگریزوں کے عہد میں یہاں مسافروں کے لیے دو سرائیں بھی تھیں۔

جہلم شہر میں وقت کے بے شمار عروج و زوال سے گزرنے کے باوجود آج بھی اس میں کئی قدیم آثار موجود ہیں۔ دریا کے کنارے قدیم عمارات نمایاں نظر آتی ہیں۔ میدانِ پاکستان، شان دار چوک، کینٹ چوک، جاوہ چوک، چوک گنبد والی مسجد، اکرم شہید میموریل پارک، اکرم شہید نشان حیدر لائبریری، اقبال لائبریری، ضمیر جعفری اسٹیڈیم، گلشن سرائے، پاک سرائے اور قدیم مندر جہلم شہر کے نمایاں تاریخی مقامات ہیں۔ اس کے علاوہ کینٹ چوک کے ساتھ جنرل پوسٹ آفس کے قریب وہ مشہور فائٹر طیارہ بھی نصب ہے جس کے جاں باز پائلٹ نے دفاع وطن کی خاطر اس طیارے سے پٹھان کوٹ اور بھارت کے دیگر ہوائی اڈوں پر کام یابی سے بم باری کی تھی۔

جہلم کو شہیدوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ اس ضلع کے اکثر لوگ فوج میں ہیں۔ کئی ایک نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ملک کا دفاع کیا ہے۔ ان سب سے زیادہ نام ملک محمد اکرم شہید نشان حیدر کا ہے۔ جن کا تعلق ضلع جہلم کے گاؤں نکہ کلاں سے تھا۔

یہاں کا تھانہ 1849ء میں قائم ہوا۔ جب کہ تھانہ سٹی کی عمارت 1935ء میں تعمیر ہوئی لیکن یہ تھانہ اس سے نصف صدی پہلے قائم ہو چکا تھا۔

جہلم میں سب سے پہلا مڈل اسکول 1875ء میں شمالی محلہ میں قائم ہوا تھا۔ بعدازاں بلدیہ دفتر کے نزدیک منتقل کر دیا گیا۔ 1930ء میں یہ اسکول ہائی ہو گیا اور اسے سبزی منڈی کے پاس نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول جہلم 1930ء میں قائم ہوا تھا۔

جہلم میں ضلعی سطح کے سرکاری دفاتر، ملٹری کالج، طلبہ و طالبات کے پوسٹ گریجویٹ کالجز متعدد ہائی اسکول، عدالتیں، ڈسٹرکٹ جیل، محکمہ موسمیات کی مشاہدہ گاہ، ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال، فوجی فاؤنڈیشن اسپتال اور اکرم شہید اسٹیڈیم موجود ہیں۔ جب کہ تفریحی سہولتوں میں لہڑی نیچر پارک، جندی پارک اینڈ پلے لینڈ، میجر اکرم شہید میموریل پارک، الطاف پارک اور جناح باغ موجود ہیں۔ اکرم شہید میموریل پارک کے اندر ایک لائبریری بھی قائم ہے۔ اس لائبریری میں بے شمار کتب موجود ہیں۔ الطاف پارک دریائے جہلم کے کنارے بنایا گیا ہے اور یہاں سے دریائے جہلم کا منظر بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔

شہر جہلم عمارتی لکڑی، کپڑے، سگریٹ اور شیشہ سازی کے کارخانوں کے لیے مشہور ہے۔ الائنس ٹیکسٹائل ملز 1954ء میں قائم ہوئی جب کہ 1954ء میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی قائم کی گئی۔ دریائے جہلم کے کنارے مسجد افغاناں سے تھوڑے فاصلے پر جوبلی گھاٹ کا تاریخی مقام ہے۔

یہاں پر سیر و تفریح کے لیے کشتیوں کا انتظام تھا۔ یہ پارک دھنپت رائے نے جارج پنجم کی تاج پوشی کی یاد میں بنوایا تھا۔ اس میں ایک بارہ دری بھی بنوائی گئی تھی اور یہاں سے سیڑھیاں اتر کر دریا تک جاتی تھیں۔ اسی مقام پر قائداعظم محمد علی جناح اور راجہ غضنفر علی نے مسلم لیگ کے جلسوں سے خطاب کیا تھا..... جہلم میں حضرت بابا سلیمان پارس کا مزار دریائے جہلم کے کنارے الطاف پارک کے ساتھ واقع ہے۔ دن بھر زائرین کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ اس مزار کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ایک میلے کی صورت میں نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جہلم شہر میں حضرت ملک محمد جہلمی اور حضرت سید بابا کرم شاہ کے مزارات ہیں۔ حضرت بابا کرم شاہ احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے آپ یہاں مقیم ہو گئے اور رحلت فرمانے کے بعد یہیں مدفون ہوئے۔

قیام پاکستان سے پہلے جہلم میں ہندو معقول تعداد میں تھے۔ جو 1947ء میں نقل مکانی کر کے بھارت چلے گئے۔ اور ان کی جگہ جہلم میں کشمیری مسلمان مہاجرین نے لے لی۔ بھارت کے سابق وزیراعظم اندر کمال گجرال جہلم کے رہنے والے تھے۔ وہ دو مرتبہ جہلم دیکھنے آئے۔

علمی اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے جہلم میں کئی ادبی تنظیمیں بھی قائم ہیں۔ یہاں کے کئی شعراء کو قومی اور بین الاقوامی شہرت بھی نصیب ہوئی۔ ان میں سید ضمیر جعفری کا نام سرفہرست ہے۔ دیگر نمایاں ادباء اور شعرا میں فقیر محمد جہلمی، غلام رسول دہلی جہلمی، عباد اللہ اختر، عبدالغفور جہلمی، مولانا کرم الدین دبیر، فضل کریم مجاہد جہلمی، زاہدہ حنا، علامہ محمد عبدالکریم قریشی، طالب قریشی اور تنویر سپرا کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

معروف ادیب ڈاکٹر طارق عزیز جو اب لاہور میں مقیم ہیں کا تعلق بھی جہلم سے ہے۔ جہلم کے ہی ایک اور ادیب عاقر شہزاد ہیں جو آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ ان کے علاوہ معروف شاعر اقبال کوثر کا تعلق بھی جہلم سے ہے۔ ملک کے معروف کارڈیالوجسٹ پروفیسر ڈاکٹر جنرل (ر) اظہر محمود کیانی کا تعلق بھی جہلم سے ہے۔

جہلم کی آبادی 1972ء کی مردم شماری کے مطابق 63,672 1981ء کی مردم شماری کے مطابق 92,646 اور 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 145847 نفوس پر مشتمل تھی۔ اس میں جہلم کینٹ کی آبادی بھی شامل ہے۔ 2005ء میں جہلم کی آبادی 18,5,972 افراد پر مشتمل تھی جب کہ اس کی موجودہ آبادی دو لاکھ پانچ ہزار سے زائد ہے۔ ☆☆☆

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی، کوئی اِکا دُکا، بوند بھی پڑ جاتی۔ گگو میاں گھبراتے ہوئے کمرے میں آئے اور امی سے بولے: ''امی جان! میری چھتری کہاں ہے؟ برآمدے میں رکھی تھی۔''

امی بولیں۔ ''بیٹے، چھتری تو فریدہ لے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، شکیلہ کے گھر جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔''

گگو میاں اچھل کر بولے: ''ہائے غضب! اب کیا ہو گا؟ وہ چھتری کھولے گی تو..... تو..... میں جا کر اسے پکڑتا ہوں۔ ابھی راستے ہی میں ہو گی۔''

امی روکتی ہی رہ گئیں اور گگو میاں گھر سے نکل، یہ جا اور وہ جا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے اور بولے: ''کیوں حاجی صاحب! آپ نے میری بہن فریدہ کو دیکھا ہے؟ ابھی ابھی ادھر کو گئی ہے۔''

ڈاکیا بولا: ''ارے میاں برخوردار! یہ کہاں کی تمیز ہے؟ نہ سلام، نہ دعا۔ جھٹ سے سوال کر دیا۔''

گگو میاں بولے: ''السلام علیکم! السلام علیکم! اب یہ بتایئے کہ آپ نے میری بہن کو دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو کیا اس کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کھلی ہوئی تھی یا بند تھی؟''

ڈاکیا بولا: ''ارے رے رے! تم نے تو ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں پوچھ ڈالیں۔ خیر تو ہے۔ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

گگو میاں نے کہا: ''یہ پھر بتاؤں گا۔ پہلے آپ میری باتوں کا جواب دیجیے۔''

ڈاکیا بولا: ''فریدہ بی بی کو میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں چھتری تھی اور وہ..... بند تھی۔''

''شکریہ۔ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ!'' گگو میاں نے کہا اور بے تحاشا بھاگے۔

سڑک کے پار ایک گلی تھی۔ گلی کے نکڑ پر خیرو کنجڑے کی دکان تھی۔ خیرو نے گگو میاں کو دیکھا تو آواز دی: ''ارے میاں! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

گگو میاں نے کہا: ''یہ پھر بتاؤں گا۔ پہلے آپ یہ بتایئے کہ آپ نے میری بہن فریدہ کو دیکھا ہے؟''

''ہاں ہاں۔'' خیرو بولا۔ ''ابھی ابھی وہ مجھ سے ایک آنے کی گاجریں لے گئی ہیں۔ کہتی تھیں، اپنی سہیلی شکیلہ کے ساتھ کھاؤں گی۔''

''شکریہ، شکریہ۔'' گگو میاں بولے: ''اب یہ بتایئے کہ ان

کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کھلی تھی یا بند؟"

خیرو بولا: "چھتری؟..... ہاں ہاں! چھتری تھی تو، پر میاں، یہ یاد نہیں کہ کھلی تھی یا بند تھی۔"

گگو میاں نے خیرو کو سلام کیا اور گلی میں گھس گئے۔ ایکا ایکی، ایک سائیکل سوار آیا اور گگو میاں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔

یہ گگو میاں کے خالو جان تھے۔ خالو جان نے پوچھا: "ارے! گگو میاں! کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

گگو میاں بولے: "سب خیریت ہے۔ ابا جان بھی خیریت سے ہیں۔ امی جان بھی خیریت سے ہیں۔ میں بھی خیریت سے ہوں۔ فریدہ کا پتا نہیں۔ وہ مجھے ملتی ہی نہیں۔"

خالو جان بولے: "فریدہ تو ابھی ابھی مجھے ملی تھی۔ شکیلہ کے گھر جا رہی تھی۔"

"اچھا!" گگو میاں اچھل کر بولے۔ "یہ بتایئے کہ اس کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کھلی تھی یا بند؟"

خالو جان نے کہا: "اس کے ہاتھ میں چھتری تھی اور وہ شاید بند تھی..... آخر بات کیا ہے؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔ السلام علیکم" گگو میاں نے کہا اور بگٹٹ بھاگے۔

اس گلی میں ایک اور گلی تھی اور اس گلی کے آخر میں شکیلہ کا گھر تھا۔ گگو میاں گلی میں گھسے ہی تھے کہ فریدہ دکھائی دی۔ وہ شکیلہ کے دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی۔

گگو میاں نے زور سے کہا: "فریدہ! فریدہ! ٹھہرو! چھتری مت کھولنا۔"

فریدہ ٹھہر گئی۔ گگو میاں بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور ہانپتے ہوئے بولے: "ہائے! اف! چھتری کھولی تو نہیں تھی تم نے؟"

"نہیں تو۔" فریدہ بولی۔ "کیوں؟ کیا بات ہے؟"

گگو میاں نے کہا "اس میں..... بل..... بل..... بلی کا بچہ ہے۔"

"بلی کا بچہ؟" فریدہ نے حیرت سے کہا اور چھتری کھولی تو سچ مچ بلی کا ایک ننھا منا بچہ کود کر باہر نکلا اور گگو میاں کی ٹانگوں سے چمٹ کر خرخر کرنے لگا۔

فریدہ بولی: "لے ہے! میں بھی تو کہوں کہ چھتری اتنی بھاری کیوں ہے! مگر یہ چھتری میں گھس کیسے گیا؟"

گگو میاں بولے: "میں نے رکھا تھا اسے۔ آج سفید بلی نے چھت پر بچے دیے تھے۔ دوسرے بچے تو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ یہ بے چارہ وہیں رہ گیا۔ اسے ایک موٹا سا بلا مار رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے بچایا اور چھتری میں چھپا دیا۔ جب اس کی ماں آئے گی تو اسے دے دوں گا۔" ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/فروری 2018ء ہے۔

جنوری 2018ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ان آئینوں کے اندر بھی درکار ہیں آئینے، چہرے کے پیچھے بھی چہرہ ہوسکتا ہے (محمد شمس حسین، بہاول پور)
- دیکھو، دیکھو میرا کمال، سر پر چڑھ کر کانو بال (علینا اختر، کراچی)
- سب کو ہے جلدی، بال بھی کٹوانا ہے، آئینہ دور میں ایسا وقت بھی آنا ہے (محمد بلال صدیقی، کراچی)
- کندھے پر چڑھا ذرا ہوا حجام کیا کاٹے گا بال، اگر گر گیا تو ہوگا بہت بُرا حال (محمد ابراہیم، اسلام آباد)
- حال بہت سنہرے ہیں نائیوں کے اب، ناداں پیچھی پھنس گئے آخر (شازیہ ہاشم میواتی، کھنڈیاں خاص)

ہونہار مصور

برف باری

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

مومنہ عامر حجازی، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

سیدہ تحریم مختار، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

زرنب سلیم، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

اریبہ عبدالجبار، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

محمد ابوبکر صدیق، ڈیرہ اسماعیل خان (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: حیاء زہرا، پشاور۔ زنیرہ بانو، کمالیہ۔ سدرہ عظیم، رمشاء مقبول، شمیم عمر، کوئین تنویر، عائشہ ارشد، رمشاء حنیف، اسیاء عمر، فضاء اکبر، لائبہ سلیم، زینت خالد، سعدیہ منشاء، شیزہ الیاس، صباء اسلم، رانا عبدالرحمن جاوید، لاہور۔ عروہ نور العین، محمد طٰہٰ عامر، محمد ابراہیم، تطہیر زہرہ، منال زبیر، محمد عیسیٰ جعفر، اسلام آباد۔ رابعہ خان، علیشہ الراضیہ، لاہور۔ محمد حسان، اٹک۔ لائبہ مشتاق، خوشاب۔ وجیہ زینب، اسلام آباد۔ شکیبہ جمیل احمد، حافظ آباد۔ اسوہ جاوید، شیخوپورہ۔ حرا ساجد، گجرات۔ فاطمہ نور العین، اسلام آباد۔ مہیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ علیہ وسیم، ڈیرہ غازی خان۔ صنم ارشد، لاہور۔ جاوید عنان، سیال کوٹ۔ ثمینہ راحت، گجرات۔ کامران وسیم، منڈی بہاؤ الدین۔ طوبیٰ نثار، جہلم۔ تنویر حسین، کراچی۔ نادیہ ارحم، کوئٹہ۔ سید منیر حسین، بھکر۔ سعدیہ کبیر، گجرات۔ عشرت منیر، فیصل آباد۔ اکبر ارشد، ملتان۔ ارشد اقبال، ڈیرہ غازی خان۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

فروری کا موضوع
باغ اور مالی
آخری تاریخ 8 فروری

مارچ کا موضوع
ہوائی اڈہ
آخری تاریخ 8 مارچ